باب12

# شخصیات

## حصہ اوّل - مقبوضہ کشمیر



میری زندگی کے ابتدائی 31 سال مقبوضہ کشمیر میں گزرے جن میں سے 1965 سے 1976 تک کا متحرک ترین عرصہ تھا۔ جب میرا ایک عام دیہاتی سکول اور ماحول سے نکل کر شہری اور مدنی ماحول میسر آنے کے علاوہ ایک نئی دنیا میں مختلف الخیال لوگوں سے واسطہ پڑا۔ کشمیر میں جن اثر انداز لوگوں سے میرا واسطہ یا رابطہ رہا یا ہوا، اور جو کشمیر کی سیاست یا میری زندگی پر اثر انداز ہوئے، ان کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

### پیر حسام دین دیوانی

میرے سکول کے ایام میں مجھے اپنے ماحول میں سب سے زیادہ متاثر اپنے نانا پیر حسام الدین دیوانی صاحب (مرحوم) نے کیا جو علاقہ کرناہ کی جانی پہچانی اور ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ ان کا آبائی علاقہ بانڈی پورہ سے ملحق کونن بابا گنڈ تھا جہاں سے بطور مدرس کرناہ تعینات ہوئے اور شادی کر کے وہیں آباد ہو گئے۔ بانڈی پورہ میں ان کے بھائی نجم الدین مرحوم بھی مشہور استاد تھے جن کے





زیر سایہ میں نے ساتویں جماعت بانڈی پورہ سکول میں پڑھی۔ بڑے قد کاٹھ اور خاطر خواہ شہرت کی حامل شخصیت تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی کے ماہر مانے جاتے تھے۔ خاندانی طور پر پیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس پر مدرس ہونا مزید عزت افزا تھا۔ ہر دو اعتبار سے وہ قابل قدر اور باعث عزت وافتخار تھے۔ اپنے علاقہ میں پیر ماسٹر صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے۔ 1930 کے بعد کرناہ کے تمام پڑھے لکھے لوگ ان کے شاگرد تھے جس وجہ سے ہماری علاقے میں بہت عزت کی جاتی تھی۔ روایتی پیر ہونے کے علاوہ دنیاداری میں بھی اہم مقام رکھتے تھے۔ دیہات میں ختم شریف پڑھانے کا بڑا رواج ہوا کرتا تھا جس کے لیے پیر ماسٹر صاحب کا میر مجلس اور روحِ رواں ہونا اس ختم شریف کی مقبولیت کا خاصا سمجھا جاتا تھا۔ پورے علاقے میں ان کی فرصت اور سہولت کے مطابق لوگ ختم ،خطمات کی تاریخ مقرر کرتے تھے۔ ان سے عقیدت مند تعویز لیتے اور دم کراتے۔ علاقے کے رسم ورواج کے برعکس ان کا لباس سفید شیروانی اور دستار ہوا کرتا تھا۔ ہر نومولود کا نام، شادی کی تاریخ اور نکاح ان کے بغیر رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان کی اس ہمہ گیر شخصیت کی وجہ سے ہماری آج تک لوگ عزت کرتے ہیں۔ ان کی اس نصیحت کو میں نے اپنے ایمان کا حصہ بنایا ہے کہ ہر ایک کے لیے نیت صاف اور بھلا سوچنا، اگرچہ وہ تمہارا مخالف ہی کیوں نہ ہو، اگر ایسا کرو گے تو تمہارے لیے برا سوچنے والا اور برا کرنے والا تمہاری زندگی میں ہی عبرت کا نشانہ بنے گا۔ میں نے زندگی بھر دیکھا کہ ان کی یہ بات پیش گوئی ثابت ہوئی اور میرے خلاف برا کرنا تو درکنار، برا سوچنے والا بھی عبرت کا نشانہ بنا۔ میرے خیال میں یہ پیش گوئی نہیں بلکہ مجھے دشمنوں اور حاسدوں سے بچانے کی دعا تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔ Do good mind not to whom میرا مقصدِ حیات رہا اور ہے۔

اس زمانے میں اس علاقے میں مذہبی حلقوں میں دو برگزیدہ شخصیات ہوا کرتی تھیں جو مجذوب لیکن عالم تھے ان کو قادر متو اور لوہار متو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ دونوں اصحاب میرے نانا جان کی بہت عزت کرتے تھے۔ دونوں ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہو کر علاقے کا گشت کیا کرتے تھے اور

جب ان کا گزر پیر ماسٹر صاحب سے ہوتا، گھوڑے سے اتر کر ان سے ملتے اور اگر سر راہ نہ مل سکیں تو ان کے گھر جا کر سلام کرتے اور دعا کراتے۔ میرے نانا کی اولاد میں سے اس وقت ایک بیٹا پیر غیاث الدین جو میرے ماموں ہیں اور میری پرورش میں ان کا بڑا ہاتھ ہے زندہ ہیں' جبکہ دو بیٹیاں بقید حیات ہیں۔ میرے نانا جب تک حیات رہے میرے لیے عزم و حوصلے کی زندہ مثال بنے رہے۔ ان کا انتقال 22 مارچ 1976 کو ہوا۔ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ دوسری شادی (جو اصل میں پہلی تھی) کی اولاد میں سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی جو دونوں صاحب اولاد تھے لیکن اب وفات پا چکے ہیں۔ میرے بڑے ماموں ڈاکٹر سراج دین تھے جن کی اولاد بارہمولہ میں آباد ہے اور خالہ کے بچے کرناہ میں آباد ہیں۔ ہمارا تعلق اور پیار مثالی ہے۔

اُٹھ گئیں اس جہاں سے کیسی کیسی صورتیں
رویئے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے

ددھیال کی طرف سے میرے اکثر رشتہ دار وادیٔ کرناہ اور سرینگر میں آباد تھے۔ ان میں سے کرناہ والوں میں سے مرحوم سید شہاب الدین گیلانی، مرحوم غلام نبی گیلانی، مرحوم گامی چاچا، قطب الدین چاچا اور مبارک شاہ جو چھتکڑی گاؤں میں رہتے تھے، کے علاوہ چھم کوٹ گاؤں سے سید میر حسن شاہ مرحوم میرا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اکثر میری ننھیال والوں کے ہاں مجھے دیکھنے اور میری دلجوئی کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتے تھے۔ ان میں سے سوائے میر حسن شاہ صاحب کے باقی سب لوگ آزاد کشمیر ہجرت کر آئے اور یہاں اپنی محنت اور دیانت سے باوقار مقام بنا لیا ہے۔ ان کی اولاد اعلیٰ تعلیم کے حامل ہونے کے علاوہ ماشاءاللہ خوش حال اور آباد ہیں۔ اللہ ان سب کو دو جہاں کی خوشیاں عطا کرے۔ آمین۔

## قاضی اور خواجہ خاندان

مقبوضہ کشمیر میں بسر ہونے والی زندگی میں جن شخصیات سے رابطہ رہا، ان کا تذکرہ نہ کرنا







میرے نزدیک گناہ ہوگا۔

اس زمانے میں سیاسی طور سب سے زیادہ اثر رسوخ رکھنے والوں میں سے قاضی عبدالرحمان، قاضی غلام حیدر، خواجہ عبداللہ جو اور خواجہ محمد یونس تھے۔ قاضی اور خواجہ خاندان کی آپس میں شدید سیاسی رقابت تھی۔ خواجہ خاندان کو سیاسی اقتدار حاصل تھا اور خواجہ محمد یونس مرحوم کشمیر اسمبلی کے پندرہ سال تک ممبر رہے جبکہ اخلاقی برتری قاضی خاندان کو حاصل تھی جو دو پشتوں سے کھانے پینے اور علم و فضل والا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ محمد یونس مرحوم تین بار بلا مقابلہ کشمیر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی اور شخص کو مقامی فوج اور انتظامیہ کی اعانت سے کاغذات نامزدگی ہی جمع نہ کرانے دیتے۔ 1972 کے الیکشن میں میرے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔ اب کی بار پہلی بار ان کو الیکشن لڑنا پڑا جس میں ہار گئے اور ان کی ہار میں میرا اور اس زمانے کے دیگر نوجوانوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ خواجہ خاندان نے اپنی نسلوں کو پڑھا کر برتری قائم کر لی لیکن قاضی خاندان نے عیاشی کی وجہ سے برتری کھو دی اور یہی اللہ کی مرضی ہے۔ تاہم اس خاندان سے قاضی عبدالواحد قریشی کو استثنیٰ حاصل ہے جنہوں نے اپنے والد قاضی غلام نبی مرحوم کی وجہ سے نمایاں علمی مقام حاصل کیا کشمیر اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہے اور نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ ان کا بھائی قاضی عبدالحمید اور بچے سب پڑھے لکھے اور نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ ٹیٹوال کے خواجہ فتح جو، بہادر کوٹ کے منشی صفدر علی، کنڈی کے زمان میر، راجہ یعقوب خان گبرا کے غلام مصطفیٰ مرچال ذیلدار، نامور لوگ گزرے ہیں جن کے نقش اب بھی پائے جاتے ہیں۔

## موہن سنگھ اور اندر سنگھ

سکھ آبادی صرف ایک گاؤں ترہ بونی میں آباد تھی۔ وہ مزدور پیشہ، زراعت پیشہ اور مقامی فوجی بریگیڈ میں عام دیہاڑی دار تھے۔ ان میں سے سردار موہن سنگھ بڑے ہی دیدہ ور اور جہاندیدہ انسان تھے ان کی وجہ سے سکھوں اور مسلمانوں کے گہرے روابط تھے۔ گردوارے میں ''پائی'' جو

ہمارے امام کی طرح کے شخص ہوتے ہیں، کے منصب پر فائز تھے۔ 2012 میں میری ان سے ساتھ ملاقات تک اس منصب پر قائم تھے۔ سردار اندر سنگھ جو ایک استاد اور بالآخر تحصیل ایجوکیشن آفیسر ریٹائر ہوئے، نے کرناہ کے لوگوں کو تعلیمی میدان میں بہت مستفید کیا۔ میں ان کا ذاتی طور شکر گزار ہوں جن کی مالی اعانت کی وجہ سے ایل ایل بی کر کے وکیل بن سکا۔ اب گوشہ نشینی اور خاموشی میں زندگی گزارتے ہیں۔ 1972 کے اسمبلی الیکشنز میں اس گاؤں کے سارے سکھوں نے ہماری بھرپور مدد کی۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہی فوجی ایجنسیوں کے پاس ہمارے خلاف غلط پروپیگنڈا کا منفی اثر نہیں ہوا۔

## پروفیسر عبدالغنی بٹ

پروفیسر عبدالغنی، فارسی زبان کے استاد تھے۔ جس سال میں نے کالج میں داخلہ لیا، اسی سال یہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر بارہ مولہ کالج میں تعینات ہوئے تھے۔ بے حد خوش پوش، خوش ذوق، رنگین مزاج اور یار باش آدمی تھے۔ کالج کے تمام اساتذہ اور طلبہ کی بھرپور توجہ کا باعث اور ہر انتظامی معاملہ میں ان کا کردار فیصلہ کن ہوا کرتا تھا۔ بے حد خوبصورت اور پُرکشش کیفیت کے حامل شخص تھے جو خواتین کی توجہ کا مرکز رہتے تھے۔ پیار سے لوگ ان کو ''غن صاحب'' کہتے تھے۔ بہت روشن خیال انسان تھے، فارسی زبان کا ترجمہ انگریزی میں کرتے تھے۔ گفتگو کے ساتھ ان کی باڈی لینگویج بہت متاثر کن تھی۔ ایک کانگریسی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حکومت میں کافی اثر و رسوخ کے حامل تھے۔ یہ بات سے بات پیدا کرتے تھے۔

ایک روز کالج کے پرنسپل ایس ایل سادھو نے ان کو کہا، پروفیسر آپ کو وکیل یا ڈپلومیٹ ہونا چاہیے تھا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا، ''میں اس کالج میں یہی کردار ادا کرتا ہوں۔'' اور فی الواقع ایسا ہی کرتے تھے۔ کالج میں پہلے دن ان کی پہلی کلاس میں میرا ایک لڑکی کے ساتھ غلط فہمی کی بنا پر ٹاکرہ ہوا، لیکن بخیر گزشت، اس کے بعد ہم دوست بن گئے اور ہر راز و نیاز میں شامل تھے۔ کسی دوسرے مقام پر اس کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ تحریک آزادی کی حمایت کی وجہ سے ان کو نوکری سے برطرف کیا گیا





جوان کی سیاسی زندگی کا باعث بنا اور آج حریت کانفرنس کے سرکردہ ترین لیڈر ہیں جو مسلم کانفرنس کے سربراہ کی حیثیت سے ہیں۔ وہ اس بات پر شاکی ہیں کہ حریت کانفرنس کو پاکستان نے تقسیم کرایا ہندوستان نہیں کروا سکا۔ گیلانی صاحب کی سخت گیری کے بارے میں وہ ایک کشمیری محاورے کے طور کہتے ہیں کہ وہ چلے کلاں (شدید ترین سردیوں) میں چاول کا بیج بو رہے ہیں یعنی ناممکن کام کر رہے ہیں۔ ان کا کشمیر کے حل کے بارے میں اندرون خانہ موقف ہے کہ چناب فارمولے کی طرز پر وادی کشمیر پاک بھارت کے مشترکہ کنٹرول میں اور بقیہ حصے ان ملکوں کے حصے بن جائیں جن کے کنٹرول میں ہیں۔ جنرل مشرف سے اور ان کے فارمولے سے بہت متاثر ہیں۔

## پروفیسر سیف الدین سوز

پروفیسر صاحب بے حد محنتی، خود دار اور سیلف میڈ شخص تھے۔ ہمیں کالج میں معاشیات پڑھاتے تھے۔ بے حد معاملہ فہم اور دور اندیش شخصیت کے حامل تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے چوٹی کے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے اور ہندوستان بھر کے معاشیات کے پروفیسرز کو کالج میں لیکچر دینے کے لیے بلاتے تھے جن میں ہندوستان کے وزیر اعظم من موہن سنگھ بھی شامل تھے۔ میں ان کا محلے دار ہونے کی حیثیت سے گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کی اہلیہ ممتاز آپا بھی ان کی طرح محنتی اور ذمہ دار تھیں جو ڈائریکٹر تعلیمات ریٹائر ہوئیں۔ ان کی ایک سالی فہمیدہ میری کلاس فیلو تھی۔ ہمارے تعلقات میں آج تک کوئی فرق نہیں پڑا۔

کالج کا سالانہ بجٹ یہی بنایا کرتے تھے اور سال میں دو بار کالج کا ایجوکیشن ٹور رکھتے تھے۔ گرمیوں میں کشمیر کے مختلف علاقوں، ڈیرہ ڈون، چندی گڑھ یا گوا، اور سردیوں میں مدراس، بمبئی، کلکتہ یا راجستھان وغیرہ کا۔ لیکن ایک طالب علم کالج کے خرچے پر پوری مدت کے دوران صرف دو ٹور کر سکتا تھا۔ اگر اس سے زیادہ کرنا چاہیے تو ٹور کے گروپ کے ساتھ اپنے خرچ پر جانے کی اجازت تھی۔ میں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور پروفیسر صاحب ذاتی خرچ پر جانے والوں میں سب سے

پہلے میرا نام رکھتے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی یا کلکتہ کا خرچ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار روپے ہوا کرتا تھا جو سکالرشپ کی رقم سے بھی پورا ہو جاتا تھا۔ جب میں نے بارہ مولہ کالج سے بی اے پاس کیا تو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں میرا داخلہ صحافت میں کرایا۔ لیکن مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ وہاں کشمیر کے لوگ بھی نہیں تھے، اس لیے میں صرف ایک ہفتہ رہنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلا گیا۔

سوز اُن کا تخلص تھا اور مقامی سطح پر مشاعروں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ زیادہ تر پروفیسر سوز کے نام سے جانے جاتے تھے۔ کالج لیکچرار سے یونیورسٹی لیکچرار اور پھر وہاں سے کشمیر یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ اپنے تعلقاتِ عامہ کی وجہ سے مرکز میں لوگوں کے ساتھ بہت تعلقات تھے جس بنا پر یونیورسٹی کی نوکری چھوڑ کر کشمیر کی سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے جس کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے ممبر بننے کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر اور مرکزی وزیر بھی منتخب ہوئے۔ یہ وہ واحد ممبر تھے جن کے اٹل بہاری واجپائی کے خلاف 2000 میں عدم اعتماد کے ووٹ کی وجہ سے ہندوستان کی حکومت اور پھر پارلیمنٹ تحلیل ہو گئی۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی پالیسی کے خلاف جا کر، واجپائی کے خلاف یہ کہہ کر ووٹ دیا کہ اس شخص کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہیں۔ اس کے بعد ممبرشپ سے استعفیٰ بھی دے دیا اور کانگریس پارٹی جوائن کر لی۔ کانگریس پارٹی کے ریاستی صدر اور مرکز میں وزیر آبپاشی اور ماحولیات بھی رہے۔ میرے ابھی تک ان کے ساتھ تعلقات ہیں اور جب بھی کشمیر یا ویلی جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ ملاقات معمول کا حصہ ہوتی ہے۔ گزشتہ ملاقات میں انہوں نے مجھے کہا کہ پاکستانیوں سے کہو، پہلے اپنے سندھی، بلوچوں اور مہاجروں سے بات کر کے ان کو اعتماد میں لیں پھر ہندوستان سے بات کریں۔ وگرنہ ہندوستان باقی ماندہ پاکستان سے صرف آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی حوالگی کی بات کرے گا۔ آج کل یہی کچھ ہو رہا ہے، جو پروفیسر سوز کی بات کی تصدیق بھی ہے۔

## سید مبارک شاہ ایڈووکیٹ

سید مبارک شاہ ایڈووکیٹ بھی بارہ مولہ میں خانپورہ محلے کے رہنے والے تھے۔ شاہ







صاحب کی کشمیر کی پہلی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر وزیر قانون بھی رہے۔ کشمیر بلکہ ہندوستان کے چوٹی کے وکیلوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سرینگر میں پریکٹس کرتے تھے لیکن رہائش اپنے محلہ میں ہی رکھتے تھے۔ مجھے ایل ایل بی کرنے کے بعد کچھ عرصہ ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ چوں کہ محلہ دار ہونے کی وجہ سے میری ان کے ساتھ شناسائی اور بے تکلفی تھی، اس لیے میں ان کے دفتر کا کرتا دھرتا تھا۔ حالاں کہ میرے ساتھ ہی ان کا ایک بھانجا نظیر احمد شاہ بھی ایل ایل بی کر کے ان کے ساتھ ہی کام کرتا تھا جو بہت سادہ لوح شخص تھا۔ ضلع بارہ مولہ میں شاہ صاحب کا بڑا دبدبہ تھا اور کسی مقدمے کی وکالت قبول کرنا اس مقدمے کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ عام طور پر چھوٹی عدالتوں میں مجھے بھیج دیتے تھے جن کے نام کی وجہ سے بڑے بڑے کام ہوا کرتے تھے۔

ایک دفعہ سوپور میں اشتمال اراضی کے تحصیلدار کے پاس ایک زمیندار کے مقدمے میں مجھے بھیجنا چاہا جس پر زمیندار نے کہا کہ شاہ صاحب آپ خود جائیں۔ لیکن انہوں نے بہ کمال مہربانی کہا کہ یہ معاملات منظور مجھ سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اس پر زمیندار نے کہا کہ جناب قانون تو جانتا ہوگا لیکن ''گرز'' یعنی برسنا نہیں جانتا ہوگا۔ اس پر شاہ صاحب نے کہا کہ مجھ سے زیادہ برسے گا، خاطر جمع رکھو۔ جس روز تاریخ مقررہ تھی، شاہ صاحب نے مجھے کہا کہ جب تحصیل دار کی عدالت میں داخل ہوں تو پہلے چپراسی کو دبانا کہ کمرا گندا کیوں ہے اور بدبو کیوں آتی ہے۔ اس کے بعد تحصیلدار سے بے رخی اور سخت رویہ رکھنا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ کیس میں بحث کے دوران میں نے سخت اور گرج دار آواز رکھی اور اسی وقت فیصلے کا تقاضا کیا۔ چنانچہ سکھ تحصیلدار بہت مرعوب ہوا اور اسی وقت ہمارے حق میں فیصلہ کر دیا۔

شاہ صاحب خود بے اولاد تھے۔ اپنے بھانجوں کی پرورش کیا کرتے تھے۔ مہینے میں ایک بار دہلی سپریم کورٹ آف انڈیا میں جاتے تھے اور دو ہفتے کے لیے متواتر سرینگر ہائی کورٹ میں موجود ہوتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ مرحوم کے بہت قریب تھے اور اکثر جیل میں بھی رہے۔ جتنا عرصہ شیخ صاحب جیل میں تھے، شاہ صاحب اور مرزا افضل بیگ ان کی وکالت کرتے رہے۔ بڑی گرج دار آواز اور شخصیت کے حامل تھے۔ عالمی معاملات پر کافی گرفت حاصل تھی۔ اس پس منظر میں ان کو حکومت ہندوستان نے

1976 میں سوڈان میں ہندوستان کا سفیر بھی مقرر کیا۔جن دنوں وہ سوڈان جانے کی تیاری کر رہے تھے اور دہلی میں مقیم تھے، میں پاکستانی ویزا لینے کے لیے دہلی گیا، جہاں ان کے پاس وزارت خارجہ کے گیسٹ ہاؤس میں ہی ٹھہرا۔ان کے پاس سوڈان کے معاملات کے ماہرین بریفنگ دینے آتے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی اور میری ذمہ داری لگی تھی کہ میں ان کی گفتگو کے منٹس لیا کروں جن کو بعد میں Develop کرتے۔

ایک روز بڑا لمبا موٹا آدمی آیا۔اپنا نام کچھ چڈھا بتایا جو ہندوستان شپ یارڈ کا ڈائریکٹر جنرل تھا۔شاہ صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ کرناہ کا رہنے والا ہے۔اس نے کرناہ کو کرنال سمجھا جو پنجاب میں ایک ضلع ہے جہاں سے اس وقت کے ہندوستانی وزیر دفاع بنسی لعل منتخب ہوئے تھے اور اندرا گاندھی کے بہت ہی قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔میں نے اس کو کہا کہ کرنال نہیں میں کرناہ ٹیٹوال کا رہنے والا ہوں۔اس پر اس شخص نے کھڑے ہو کر مجھے گلے لگا کر کہا، میں پٹھکہ سکھاں کا رہنے والا ہوں۔یہ مظفرآباد کے قریب ایک گاؤں ہے اور آٹھویں جماعت تک ٹیٹوال میں پڑھا ہے جہاں میرے والد صاحب پوسٹ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔اس نے اپنے کئی ہم جماعتوں کا نام بتایا جن میں سے ایک میرے والد صاحب مرحوم بھی تھے۔میرے والد صاحب اس کا تذکرہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ چڈھا کلاس میں ہمیشہ سو فیصد نمبر لیا کرتا تھا۔

ہجرت کر کے ہندوستان جانے اور وہاں آباد ہونے والے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے لیکن ان کا اپنے علاقے سے محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ڈنہ کچیلی کا ایک سکھ جنرل بھی وہاں ملا جو منسٹری آف ڈیفنس پروڈکشن میں کسی عہدے پر فائز تھا۔شاہ صاحب مرحوم میرا ان لوگوں سے تعارف ایسے کرواتے تھے جیسا کہ میں ہی سفیر مقرر ہوا ہوں۔بڑے لوگ دوسروں کو بڑا کہہ کر بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

## سید علی گیلانی

سید علی شاہ گیلانی کے نام سے کون واقف نہیں۔1989 کی مسلح جہدوجہد سے قبل وہ غیر مسلح





230

جہدوجہد کے دوران تبلیغ، مسلمانوں کی بیداری، کشمیری مسلمانوں کی زبوں حالی یا پاکستان کے لیے محبت ان کی جہدوجہد کا حصہ ہیں۔ان کے ساتھ خاندانی رشتہ کے قطع نظر ان کے علم وفضل، جرأت و ہمت کا میں شروع سے قائل ہوں۔1960 کی ابتدائی دہائی کی بات ہے کہ آچاریہ ونوبا بھاوے جو ہندوستان کے چوٹی کے روحانی لیڈروں میں سرفہرست تھے۔جب کشمیر کے دورے پر سوپور قصبہ میں آئے اور ہندو فلاسفی کے مطابق عام لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے ان لوگوں کے عقیدہ کو ایکسپلائیٹ کرنا شروع کیا جو ان کی جادوگری کا پہلا زینہ تھا۔وادی کشمیر پر چوں کہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ ہے جو ہندو اور ہندوستانی تہذیب میں کسی طور سمونے کے لیے تیار نہیں اور اب بھی یہی تہذیب ہے، ونوبا بھاوے اور دیگر ہندو فلاسفر مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے مسلمان خانقاہوں سکولوں اور عیدگاہوں میں سیرت نبی ﷺ کے جلسوں میں شرکت کرتے۔اچاریہ ونوبا بھاوے نے سوپور کے جلسہ میں قرآن پاک کی ایک آیت ''ممارزقناھم ینفقون'' پڑھ کر لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی زمینوں میں سے کچھ حصہ ان کو دیں تاکہ وہ بے گھر لوگوں کو آباد کر سکیں۔ان کی یہ تحریک پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔کشمیر میں ان کا مقصد عام مسلمانوں سے زمین لے کر اس پر نام نہاد بے گھر ہندوؤں کو بسایا جائے۔اس پر ایک نوجوان جس کا نام علی گیلانی بتایا گیا کھڑا ہوا اور ونوبا بھاوے کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ آپ نے جو قرآنی آیت پڑھی ہے، آپ کا اس پر ایمان ہے؟ جواب میں با بھاوے نے کہا، ہاں۔اس پر گیلانی صاحب نے کہا کہ اس کے باوجود اگر آپ اہل کتاب میں شامل نہیں ہوتے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ صرف مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ایکسپلائٹ کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔آپ کا مقصد نیک ہے لیکن اس کو حاصل کرنے کے لیے قرآن کو استعمال نہ کریں۔اس پر جلسہ میں ہوہو کار برپا ہوگئی۔اچاریہ جی چلے گئے لیکن گیلانی صاحب کی زندگی میں چھپی لیڈرشپ کی چنگاری واشگاف کر گئے۔غالباً اس کے بعد انہوں نے استاد کی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا یا نکال دیئے گئے۔

1972 میں جب جماعت اسلامی نے ریاستی الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔میں نے جماعت کے

ہمنوا اخبار ترجمان الحق کے ذریعہ اس کی شدید مخالفت کی تو گیلانی صاحب نے میری سخت تنبیہ کی اور اخبار کو ہدایت کی کہ دوبارہ اخبار ایسے لوگوں کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ گیلانی صاحب کی اس تنبیہ نے مجھے جماعت اسلامی سے نکال کر کانگریس کا ہمنوا بنا دیا۔ لیکن مجھے اس بات پر خوشی ہو رہی ہے کہ جو باتیں میں نے اس وقت اس کی مخالفت میں کہی تھیں، بعد ازاں جماعت اور اس کے جلسوں پر پابندی لگانے کے ذریعے درست ثابت ہوئیں۔ گیلانی صاحب اب تک اس فیصلہ کو درست گردانتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیاست اور مذہب ایک چیز ہیں۔ سیاست اور سیاسی فیصلوں میں بسا اوقات مذہب کے واضح اصولوں کے خلاف عوامی مفاد کے نام پر فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ سیاست ارتقائی منازل طے کرتی رہتی ہے لیکن مذہب کے بنیادی اصول ایک جیسے ہی رہتے ہیں ان کی تشریح اور نفاذ میں حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی لائی جاتی ہے۔ اس لیے مذہب اور سیاست ہر معاملہ میں اکھٹے نہیں رکھے جاسکتے۔ گیلانی صاحب غالباً تین بار مقبوضہ کشمیر اسمبلی کے ممبر بنے ہیں۔

کشمیر میں 1989 کی تحریک کے بعد گیلانی صاحب خالصتاً پاکستان کے ہمنوا کشمیری مسلمانوں کی حیثیت سے تحریک کے افق پر چھائے رہے۔ ان کی عسکری تحریک حزب المجاہدین اور سیاسی ''تحریک حریت جموں وکشمیر'' ہے، جس کی وجہ سے کشمیری تحریک میں جان ہے۔ میں 2004 میں جب 1989 کی تحریک مزاحمت کے بعد پہلی بار کشمیر گیا تو گیلانی صاحب کے گھر ان سے دوبار تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میرا دورہ نجی تھا لیکن ایک اعلیٰ سرکاری منصب یعنی جج، سپریم کورٹ اور چیف الیکشن کمشنر کے عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے میرے دورے کو سرکار، سیاسی اور عوامی حلقوں نے کسی ڈپلومیسی کا ہی حصہ سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ دورے سے پہلے میری ملاقات صدر پاکستان جنرل مشرف سے ہوئی تھی جہاں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل کیانی بھی موجود تھے۔ اس کے بعد میں 2005، 2010 اور 2012 تا 2015 میں بھی سرینگر گیا اور گیلانی صاحب سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ زیادہ تر نظر بندی میں ہی رہتے ہیں لیکن نظر بندی گھر میں ہی ہوتی ہے جہاں عمومی طور پر ملاقاتوں پر پابندی نہیں ہوتی۔ میں نے ہر بار گیلانی صاحب کی ہمت اور جرأت کو تازہ دم پایا۔ 1959 سے آج تک میں





جتنی بار ان سے ملا، ان کے حوصلے، جذبے، گفتگو، دلیل اور کمٹمنٹ میں کوئی فرق نہیں پایا۔ کشمیر کی حریت کی تحریک کے لیڈروں میں سے وہ واحد صاحب کتاب سیاست دان ہیں جنہوں نے مذہب سیاست، معاشرت، کشمیر کی مزاحمتی تحریک پر درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔

جنرل مشرف کی ہمت وجرأت کے وہ بہت قائل تھے۔ البتہ ان کی سوچ اور فکر کے سخت مخالف۔ جنرل صاحب نے مجھے ان کے لیے پیغام دیا تھا کہ ''اس کو کہو، وہ ہمارے معاملات فاٹا وغیرہ میں دخل نہ دے، اپنے کام سے کام رکھے۔'' جب میں نے ان سے یہ بات کہی تو جواب تھا کہ ''پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کا ملک ہے، صرف پاکستان میں رہنے والوں کا ہی نہیں کیوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بقا کی ضمانت اور اسلام کی علامت ہے۔ اگر جنرل صاحب کی یہ بات مان لی جائے تو ان کو بھی ہمارے معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے جب گیلانی صاحب سے ان کی تحریک کے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو ان کا جواب تھا کہ ''تحریک قوم کی امانت ہوتی ہے جس کو دیانت داری سے چلانا چاہیے اور جب تک اس میں دیانت موجود رہے گی اس کی کامیابی کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی جائے گی۔'' آپ کے بعد کیا ہوگا؟ کے سوال پر جواب تھا کہ ''میں بھی تحریک اور قوم کی امانت ہوں لیکن ناگزیر نہیں ہوں۔ ہم نے لوگوں کی تربیت کی ہوئی ہے لیڈرشپ کا خلا کبھی نہیں ہوگا۔''

جب میں نے ان سے یہ کہا کہ اگر کشمیری مسلمان، ہندوستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تو کشمیری ہندو، مسلمان پاکستان کے ساتھ کیوں رہے؟ ان کا جواب تھا کہ ''اسلام میں ان کے تحفظ کی گارنٹی موجود ہے جبکہ ہندوؤں کے پاس کسی غیر ہندو کے تحفظ کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔'' کشمیر کے عملی حل کے سوال پر ان کا جواب تھا، ''اس کا عملی حل سلامتی کونسل کی قراردادوں میں ہی ہے اور اگر اس سے مماثلت رکھنے والا کوئی اور حل ہے تو پتنی ٹاپ سے مغرب کی طرف کا علاقہ پاکستان کو دیا جائے تو تقسیم بھی منظور ہے۔ اور اگر یہی علاقہ بشمول آزاد کشمیر ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر وجود میں آجاتا ہے تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہے کیوں کہ جس علاقے میں ہندوستانی فوج نہیں ہوگی، وہ پاکستان ہی

ہوگا۔لیکن یہ فارمولہ ہندوستان کی طرف سے آنا چاہیے۔ہم کو یہ فارمولہ لے کر ہندوستان کے پاس نہیں جانا چاہیے۔'' گیلانی صاحب پاکستان کی کمزور سیاسی اقتصادی اور خارجی حالت پر بہت نالاں تھے۔ فاٹا کے علاقہ پر امریکیوں سے مل کر ان پر ظلم کے پہاڑ توڑنے پر بہت رنجیدہ تھے۔ بلوچوں کے ساتھ زیادتی سے بھی بہت نالاں تھے۔

کشمیر کی تحریک سے اگر گیلانی صاحب اور ان کی تحریک کو الگ کیا جائے تو وہ خاک کا ڈھیر ہے۔حریت کا دوسرا بڑا دھڑا ہندوستان کے قومی دھارے میں شامل نہیں ہے لیکن ضمانت ملنے کی صورت میں شمولیت کے لیے تیار ہے۔وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پھنسا ہوا ہے۔شامل ہوتا ہے تو پاکستان اور کشمیریوں کی ہمدردیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور اگر شامل نہیں ہوتا تو تنہا رہ جائے گا۔ اس لیے اپنی بقا گیلانی صاحب کی سخت گیری میں سمجھتے ہیں۔ہندوستان کا ان پر ہاتھ اس لیے نرم ہے کہ مسلمہ علیحدگی پسند قیادت میں سے یہ لوگ اس کے خلاف متشدد نہیں ہیں اور پاکستان بھی ان کو اس لیے نیم دلی سے آگے بڑھاتا ہے کہ ان کو ڈھال بنا کر کشمیر پر ہندوستان سے کوئی راہ نکالنا چاہتا ہے جبکہ کشمیر کی عوام گیلانی صاحب کے ساتھ والہانہ عقیدت رکھتے ہیں جیسا کسی زمانے میں مرحوم شیخ عبداللہ کے ساتھ تھی،جن کا عوامی چہرہ پاکستان/کشمیری،لیکن سرکاری چہرہ ہندوستانی تھا۔لوگ عوامی چہرے کو دیکھتے تھے جبکہ گیلانی صاحب کا ایک ہی چہرہ ہے اور وہ اینٹی انڈیا ہے۔ پاکستان کی حکومت،عوام کے خوف سے گیلانی صاحب کو نظر انداز نہیں کر رہے جبکہ ہندوستانی خوف سے ان کو پروجیکٹ نہیں کر رہے، یا وہ مقام نہیں دے رہے جس کے وہ حق دار ہیں۔وہ چوں کہ ایک سیاسی کارکن اور رہنما ہیں، اس لیے پاکستان کی سرپرستی کے محتاج نہیں ہیں۔جنرل راحیل شریف کے پاکستانی فوج کے سربراہ بننے کے بعد گیلانی صاحب پاکستان کی حکومت کی توجہ کا مرکز بنے،وگرنہ انہیں سخت گیر کہہ کر نظر انداز کیا جاتا تھا۔

ہندوستان باقی لوگوں کے مقابلے میں ان کی بہت عزت کرتا ہے۔حال ہی میں ہندوستان کی حساس ایجنسی کے سربراہ اے ایس دلت نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اعتراف کیا ہے کہ سوائے سید علی گیلانی کے باقی سارے کشمیریوں کے اس کے ساتھ تعلقات اور ہندوستان سے پیسے لیتے تھے۔





یہ گیلانی صاحب کے لیے بہت بڑا خراجِ عقیدت ہے۔ان کی عوامی مقبولیت 230 اور ساکھ کی سطح آسمان کو چھو رہی ہے۔انہوں نے اس لیڈرشپ کے ایسے نقوش مرتب کر دیئے ہیں کہ ان کی پارٹی کے لوگ ہی نہیں، عام لوگ بھی ان کو قابل تقلید سمجھتے ہیں اور ان کو قائم رکھنے میں ہی اپنی بقا سمجھتے ہیں۔ میری نظروں میں اس وقت اشرف صحرائی صاحب ان کے جانشینی کے قریب تر ہیں جو قربانیوں،فصاحت و بلاغت میں ان کا دوسرا رخ ہیں۔گیلانی صاحب نے اپنی جائیداد ایک ٹرسٹ تیار کر کے اس کو وقف کر دی ہے اور اپنے گاؤں میں جدید علوم اور ٹیکنالوجی سے مربوط ایک کالج قائم کیا ہے جو بھی ٹرسٹ کے تحت چل رہا ہے۔ میں نے 2014 میں اس کالج کو خود دیکھا اور مجھے یقین ہے کہ کسی وقت یہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسا ادارہ ثابت ہوگا۔گیلانی صاحب بلا شبہ ایک نابغہ روزگار شخص ہیں اور یقینا اقبالؔ نے ان جیسے ہی جواہر کے لیے کہا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

## شیخ محمد عبداللہ مرحوم

شیخ محمد عبداللہ مرحوم جن کو کشمیری پیار سے شیر کشمیر کہتے تھے،تقسیم کشمیر کے بعد 1953 سے 1972 تک ماسوائے چند قلیل وقفوں کے جیل میں ہی رہے۔میں نے پہلی بار ان کو جون/ جولائی 1964 میں اس وقت دیکھا جب وہ رِہا ہونے کے بعد پہلی بار بارہ مولہ کے دورے پر آئے۔میں اس زمانے میں کالج کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔ہمارے کالج کی جانب سے چند طلباء کو استقبالیہ کمیٹی میں رکھا گیا جس کے چیئرمین مظفر حسین بیگ تھے جو اس وقت کالج کے آخری سال میں تھے۔ وہ اپنی اہلیت، فصاحت، بلاغت اور طالب علم لیڈر کی حیثیت سے نمایاں پوزیشن رکھتے تھے۔کئی بار جیل جا چکے تھے۔ انہوں نے جلسہ میں دھواں دار تقریر کی۔ بیگ صاحب مقبوضہ کشمیر میں پی ڈی پی کے ٹکٹ پر اسمبلی کے ممبر اور اس کے نائب وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں اور پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔اس جلسے میں شیخ صاحب سے میرا

پہلا تعارف ایک رسم سے زیادہ نہیں تھا۔ البتہ شیخ صاحب کی دھواں دار تقریر نے میرے دل میں بھی چنگاری سلگا دی۔ شیخ صاحب کو اس کے بعد دوبار نظر بند کیا گیا۔

شیخ عبداللہ سے آپ ہزار اختلاف کریں لیکن قد کاٹھ اور بے زبان کشمیریوں کو زبان دینے کی وجہ سے کشمیر نے ان سے بڑا لیڈر پیدا نہیں کیا اور وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ جو بھی ان سے ملتا، ان کی شخصیت سے متاثر اور مسحور ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآن خوانی اور خوش الحانی میں وہ بے مثال تھے۔ بات میں گرج، اثر اور قائدانہ روح رکھتے تھے۔

مشرقی پاکستان پر ہندوستان کے قبضہ اور اس کے الگ ملک بننے کے بعد شیخ صاحب کو 1972 میں دوبارہ رِہا کیا گیا۔ میں نے اس وقت وکالت شروع کر دی تھی۔ اس زمانے کے اخبارات اور رسائل کی یادداشت میرے ذہن میں محفوظ ہے جس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ شیخ صاحب کو 1965 میں آپریشن جبرالٹر کی ناکامی اور 1971 میں پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد کشمیر کے پاکستان کو جانے یا ہندوستان سے الگ ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ انہوں نے اپنی کتاب ''آتش چنار'' میں لکھا ہے کہ کشمیر لینے کی پاکستان کی آخری بس، ہندوچین جنگ 1962 میں چھوٹ گئی۔ پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رویہ میں تبدیلی لائی اور یہ رویہ/ موقف اختیار کیا کہ ان کو کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق پر اعتراض نہیں ہے، البتہ الحاق کے حدود پر اعتراض ہے۔ زبان کے اس ٹکڑے کو اس طرز جنبش دے کر شیخ صاحب نے ہندوستان کے ساتھ کمپرومائز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جیل سے ہی شیخ صاحب نے اندرا گاندھی سے رابطہ استوار کر لیا اور جون 1972 میں جیل سے رِہا ہونے کے بعد انہوں نے ریاست بھر میں عوامی رابطہ کی مہم شروع کی جگہ جگہ بلکہ ہر حلقہ انتخاب کا دورہ کیا۔ غالباً یہ ستمبر یا اکتوبر 1974 کی بات ہے کہ شیخ صاحب علاقہ کرناہ کے دورہ پر آئے۔ دورے سے قبل انہوں نے اپنے معتمد ساتھیوں غلام محی الدین ایڈووکیٹ اووڑی اور عبدالاحد وکیل سوپوری کے ذریعہ کرناہ سے مجھے اور عبدالرشید مرچال کو ٹنگڈار کے ڈاک بنگلہ میں ملاقات کے لیے بلایا۔ میں نے ان سے دعوت اخبار کے لیے انٹرویو لینے کا بھی وقت لیا۔ انہوں نے







اخبار کے لیے تو انٹرویو نہیں دیا۔ البتہ جو سوالات میں ان سے اخبار کے لیے پوچھنا چاہتا تھا، وہ اس شرط پر جواب دینے کے لیے آمادہ ہو گئے کہ ان کو شائع نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

میں نے پوچھا کہ اتنے عرصہ کی قید و بند کے بعد آپ نے پہلے سے کم شرائط پر دوبارہ قومی دھارے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا، اس سے آپ کو اور قوم کو کیا فائدہ ملا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اب عالمی حالات بدل گئے ہیں اور پاکستان کی بھی وہ حیثیت نہیں رہی ہے۔ 1961 کی ہند چین جنگ سے فائدہ نہ اٹھا کر اور 1971 میں اپنے آپ کو دولخت کر کے پاکستان نے اپنا اور مسلمانوں کا وقار مجروح کیا ہے۔ اب پاکستان کوئی بھی کردار ادا نہیں کر سکتا اور کشمیر کو لینے کی پاکستانی بس اب چھوٹ چکی ہے۔ کشمیریوں کو ہندوستان کے ساتھ باوقار طریقے سے رہنا سیکھنا چاہیے جہاں ان کو آگے بڑھنے کے بہت مواقع ہیں۔ ہندوستان ملٹی کلچرل ملک ہے، کسی کو بھی کسی کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہے۔ سیکولرازم ہے جس کی وجہ سے ہر آدمی کو آگے آنے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین، ابوالکلام آزاد، ہدایت اللہ اور چند مسلمان لیڈروں کے نام لیے، جن کو ہندوستان میں آگے آنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے کشمیر کے آئین کا حوالہ دے کر کہا کہ ہندوستان میں رہنے کے باوجود ہم خود مختار ہیں، جب تک ہم ہندوستان کو اجازت نہ دیں، وہ یہاں کوئی بھی قانون نہیں بنا سکتا۔ یہ آپ کے مظفر آباد میں نہیں ہو سکتا ہے، جہاں جس کو جب چاہے نکال دیتے ہیں، بند کر دیتے ہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور یہی حال پورے پاکستان کا ہے۔ کشمیر کو ہمسایہ روس، چین، ہندوستان، پاکستان اور افغانستان کبھی خود مختار ملک نہیں رہنے دیں گے، ہمیشہ خانہ جنگی رہے گی، اس لیے جو ہوا ہے، وہ بہت اچھا ہوا ہے اور میں آپ نوجوانوں کو میرے ہاتھ مضبوط کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم لوگ ان کی پارٹی میں شامل ہو جائیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اگر آپ نے سارے کا سارا کشمیر ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ شامل نہیں کیا، تو اس کو الگ ملک کے طور اکٹھا کیوں نہیں رکھا؟ شیخ صاحب نے اس کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا کہ کشمیر کی ایک جغرافیائی اور تہذیبی حیثیت ہے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ کشمیر کے علاقے

بھی جانے پہچانے ہیں جو کشمیری بولنے والوں پر مشتمل وادی کشمیر اور اس کے متصل علاقے ہیں جن کو آپ صوبہ کشمیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم کشمیریوں کو ہندوستان کے اندر اس حیثیت میں رکھنا چاہتے تھے جس حیثیت میں یہ برٹش انڈیا کے وقت تھا، پاکستان کے ساتھ شامل نہیں کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اس طرح اس کی سیکولر حیثیت مجروح ہو جاتی ہے جو ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ اور آپ نے دیکھ لیا کہ قبائلی پٹھانوں نے اس کو مجروح کیا جس سے ہمارے شک وشکوک سچ ثابت ہوئے ہیں۔ ہم کشمیر کا جتنا حصہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، اتنا پاکستانی قبائل اور فوجوں سے خالی کروالیا۔ اس کے بعد انگریزی میں اس طرح کے الفاظ کہے:

Rest was tribal and turbulent and we ordered our forces to hault beyond particular points.

میں نے ان سے ایک سوال اور پوچھا کہ آخر کشمیر کے مسئلے کا حل کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا، یہی جو پاکستانیوں کے پاس ہے وہ ان کے پاس رہے اور جو ہندوستان کے پاس ہے وہ ہندوستان کے پاس رہے۔ دونوں حصوں کو مکمل اندرونی خودمختاری ہو۔ لوگوں کو آسانی سے آنے جانے کی سہولت ہو اور جہاں جہاں ضرورت ہو بارڈر لائن کو سیدھا کر دیں۔ اس پر میں نے پوچھا کہ آپ کا مطلب ہے کہ بارڈر لائن سیدھا کرنے کی صورت میں ہمارا علاقہ کرناہ، کیرن، اوڑی، پونچھ، منڈھیڑ وغیرہ پاکستان کے پاس چلے جائیں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں نہیں۔ ان علاقوں میں جو قدرتی لائن یعنی دریا، ندی نالے اور پہاڑ ہیں ان کی تقسیم ایسی ہو کہ قدرتی جغرافیائی تقسیم لگے، پورے کے پورے علاقے نہیں۔ ہاں جموں، کشمیر اور لداخ کا الگ الگ صوبہ بنایا جائے جن کا مقامی مرکز ایک اور قومی مرکز دہلی ہو۔ اس کے علاوہ بہت سے باتیں تھیں جو کہ ہماری مقامی سیاست سے تعلق رکھتی تھیں مثلاً حلقہ بندی کی بات کی کہ کرناہ اور کیرن کا حلقہ الگ الگ ہونا چاہیے اسمبلی اور کونسل میں اس علاقے کا ہی ممبر ہونا چاہیے۔ فوج کی مداخلت اور انتظامیہ کی مداخلت کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ سرکردہ شخصیتوں کی پوزیشن کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ میں نے جب 2005 میں عمر عبداللہ ان کے پوتے سے سرینگر میں







ملاقات کی تو انہوں نے بھی تقریباً ایسی ہی باتیں کیں جو حیران کن حد تک شیخ صاحب مرحوم کی باتوں سے ملتی جلتی تھیں۔

انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے ٹیٹوال کے سامنے پاکستانی مقبوضہ علاقے کو دیکھا ہوگا، ان کی حالت ہمارے علاقے کے مقابلے میں کیسی ہے؟ اس زمانے میں ٹیٹوال کے سامنے والا آزاد کشمیر کا حصہ واقعی خستہ حال، کچے مٹی کے مکان اور تقریباً 100 کلومیٹر سے زائد ایریا کے لیے پیدل چلنے کا خطرناک راستہ تھا جبکہ ہندوستان والا حصہ خوش حال نظر آتا تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پاکستان بننے سے قبل تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا۔ جب میں نے ان کو کہا کہ اگر آپ نے کشمیر کو پاکستان میں شامل کیا ہوتا یا خود پاکستان چلے گئے ہوتے تو قائداعظم کے بعد آپ لیڈر ہوتے۔ اس پر وہ ہنسنے کے بعد بولے کہ قائداعظم کو ان لوگوں نے ایمبولینس میں مارا، مجھے لیاقت باغ میں لٹکا کر مار ڈالتے۔ وہ جاگیرداروں، نوابوں، فوجیوں اور وڈیروں کا ملک ہے، عام لوگوں کا نہیں۔ اگر میں بھی پاکستان چلا جاتا تو میرے لوگوں کو پاکستانی اور ہندوستانی قبائل اس طرح قتل کر دیتے جس طرح جموں اور پنجاب میں قتل عام ہوا۔ اس طرح کی اور بہت سے باتیں کیں اور ہمارے سوالات کے جواب دیئے۔ بہت سارے جوابات سے ان کے شکست خوردہ ہونے کی جھلک نمایاں تھی۔ اندرا گاندھی کے ساتھ معاہدے اور کانگریس کی بیساکھیوں پر وزیراعلیٰ بننے کے سوال پر شرمندگی کے احساس کے ساتھ دفاع کیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آخر مسئلہ کا حل کیا ہے؟ انہوں نے کہا مسئلہ کا اصل حل تو ''نیا کشمیر'' کا منشور ہی تھا لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ اب موجودہ سرحدوں کو مستقل بنیادوں پر قائم ہو جانا چاہیے۔ ریاستی باشندوں کا قانون محفوظ ہونا چاہیے اور ریاستی باشندوں کو سرٹیفکیٹ کی بنا پر ریاست کے دونوں حصوں میں آنے جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

13 نومبر 1974 کو تحریر ہونے والے معاہدہ جو ''اندرا عبداللہ'' معاہدہ کے نام سے موسوم ہے، کے تحت، شیخ صاحب کو کشمیر کی حکومت فروری 1975 کو سونپ دی گئی۔ انہوں نے کشمیر اسمبلی میں اس کے بعد پہلی تقریر میں بڑے فخر سے کہا کہ مجھے بہت خوشی ہوئی جب میں نے کرناہ، اوڑی اور

مینڈھر جیسے علاقے کے نوجوانوں میں سیاسی شعور اجاگر دیکھا اور قومی حالات پر بھی ان کی نظر ہے۔ انہوں نے بالخصوص کرناہ کے دونوجوانوں کا ذکر کیا، نام تو نہیں لیا لیکن یقیناً اشارہ ہماری ہی جانب تھا۔ غالباً نام یاد نہ رہا ہوگا یا مصلحتاً نہیں لیا ہوگا۔

شیخ صاحب جس بات کا لفظوں میں اظہار نہیں کر سکے، یہ تھی کہ کشمیر کے کشمیری بولنے والے حصے انہوں نے ہندوستانی فوجوں کے ذریعے قبضہ میں لائے اور غیر کشمیری بولنے والے ایریا کو الگ کر دیا جو زیادہ تر پہاڑی لوگوں پر مشتمل تھے۔ آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت میں سے سردار محمد عبدالقیوم خان کے کشمیری بولنے والوں کے بارے میں 1990 سے پہلے ایسے ہی خیالات تھے جن کو وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ لیکن وادی کے جن کشمیری بولنے والے لوگوں کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے، وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں۔ 1990 میں کشمیری مجاہدین اور مہاجرین کے آنے کے بعد وہ مکمل طور پر تبدیل ہو گئے۔ یہ ان کی سیاسی حکمت عملی تھی۔



وادی کشمیر میں کشمیری بولنے والے اکثر لوگوں کے جذبات بھی غیر کشمیری بولنے والوں کے لیے ایسے ہی ہیں جس وجہ سے جموں اور لداخ کے علاوہ وادی کے اندر بسنے والے غیر کشمیری زبان بولنے والے لوگوں نے الگ الگ پریشر گروپ بنائے ہیں جو پہاڑی فورم، گوجری فورم، ڈوگری فورم، لداخی اور بلتی فورم کے نام سے موسوم ہیں۔ ان گروپس کی پشت پناہی مرکزی حکومت بھی کرتی ہے جس کے کارندوں کا یہ مرکزی خیال ہے کہ کشمیر میں شورش صرف کشمیری بولنے والے لوگ ہی کرتے ہیں جو ضلع اننت ناگ کے کھنہ بل سے ضلع بارہ مولہ کے درنگلہ بل تک محیط ہیں۔ اور ان میں سے بھی شیعہ، گوجر اور پہاڑی آبادی ان کے ساتھ نہیں ہے۔

ریاست کی موجودہ تقسیم نہرو، شیخ ملی بھگت سے ہوئی لگتی ہے کیوں کہ اس میں کشمیری بولنے والے اور ہندو اکثریت والے علاقے ہندوستان کے پاس رہے اور باقی پاکستان کے پاس۔ یہی بات کلدیپ نے اپنی کتاب Beyond the Lines کے صفحہ 63 پر جنرل کلونٹ سنگھ کے حوالہ سے لکھی ہے جو اس وقت کشمیر آپریشن کے انچارج تھے:



230

"Why did you stop and not took over the whole Kashmir? A question I posed to Lt. General Kalwant Singh who headed the Kashmir operation, many years after cease fire. He said that the Prime Minister had instructed him to go up to the area where the population spoke Kashmiri. Nehru did not want army to go into the Punjabi-speaking territory of now (Azad Kashmir). In a sense Nehru wanted only the Kashmir valley. This thinking was clear from what be offered to Liaqat Ali khan at the common wealth Prime Ministers conference in London in October 1947. It was the division of the state with certain areas in western Poonch and the north-western part of the State of Jammu & Kashmir."

2005 میں جب میری عمر عبداللہ سے ایک تفصیلی ملاقات ہوئی، اس کے خیالات بھی ان ہی جذبات کے عکاس تھے اور اس وقت کے فوجی گورنر سہنا نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ عمر عبداللہ مجھے فاروق عبداللہ کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال اور بامعنی شخص لگے۔ انہوں نے واضح کہا کہ جموں اور لداخ کے لوگ اگر ہمارے ساتھ کمفورٹ ایبل فیل نہیں کرتے تو الگ ہو جائیں۔ ہندوستانی کشمیر کے اندر ہی نہیں بلکہ آزاد کشمیر میں بھی یہ تعصب نمایاں ہے، جہاں وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والوں کو بالخصوص اور سارے کشمیری بولنے والوں کو بالعموم یہاں کہ لوگ کشمیری کہتے ہیں اور اپنے آپ کو صرف اس وقت کشمیری کہلاتے ہیں جب آزاد کشمیر سے پاکستان کے دیگر علاقوں میں یا بیرون ملک پناہ لینے کے لیے جاتے ہیں۔ یہ کشمیر کی عجیب سائیکی ہے۔ 2014 کے کشمیر اسمبلی کے الیکشن سے بھی یہ تفریق واضح ہوگئی جن میں جموں لداخ اور کشمیر وادی کی ترجیحات بالکل الگ الگ جغرافیائی، مذہبی اور لسانی تقسیم پر بنتی ہیں اور یہی شیخ عبداللہ مرحوم کی سوچ تھی۔

شیخ صاحب نے 8 ستمبر 1982 کو سرینگر میں وفات پائی، ان کی مقبولیت کا بعد از مرگ بھی تمام تر شکایات اور غلطیوں کے باوجود یہ عالم تھا کہ ان کے جنازے میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی۔

جنازے کا جلوس دیکھ کر اندرا گاندھی وزیراعظم ہند جو جنازے میں شریک تھیں، نے کہا کہ ''میری خواہش ہے کہ میری ارتھی بھی اسی دھوم سے نکلے۔'' مرحوم کو نسیم باغ حضرت بل میں برلب جھیل ڈل دفن کیا گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے مزار پر پولیس کا پہرا ہے کہ کوئی ان کی نعش کو نکال کر بے حرمتی نہ کرے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ازراہِ احترام ہے جیسے کہ پاکستان میں ایسے اکابرین کے مزاروں پر ہے۔ شیخ صاحب مرحوم نے تدفین تک اپنی لیڈرشپ کا سحر قائم رکھا۔ ان کے مقابلے کا لیڈر کشمیر میں کوئی پیدا نہیں ہوا جو عوام کی رائے کی سمت مقرر کرتا تھا، اس کے پیچھے نہیں چلتا تھا۔ مرحوم کی یہی غلطی تھی کہ اس نے عوام کی رائے اور جذبات کو وزن نہیں دیا، اس کو مربوط نہیں کر سکا، اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا بلکہ اپنی من مانی کی، جس وجہ سے آج تک وادی کشمیر قتل گاہ بنی ہوئی ہے۔

اگر پاکستان مسلم لیگ کی قیادت نے مہاراجہ ہری سنگھ کی بجائے شیخ عبداللہ کو اپنایا ہوتا اور چوہدری غلام عباس مرحوم کو شیخ صاحب کا ساتھ دینے کو کہا ہوتا تو تو کشمیر کا قضیہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ وادی کشمیر اور جموں صوبے کے کشمیری بولنے والے لوگ ان ہی کے ساتھ تھے۔ مہاراجہ بھی گومگو کا شکار تھا۔ بالمقابل مسلم کانفرنس کی لیڈرشپ کا کردار اور حیثیت قائداعظم کی مرہون منت تھی۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد یہ سارے لوگ اسی لیے پاکستان ہجرت کر آئے جس وجہ سے جموں کے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا۔ شیخ صاحب کو ایسا فیصلہ کرنا چاہیے تھا یا نہیں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے، لیکن ان کو نظر انداز کرنا بھی بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ ہندوستان نے صحیح وقت پر ان کو بھرپور تعاون دے کر استعمال کیا جس کے بعد مکھن میں سے بال کی طرح نکال دیا جس کی سزا کشمیر وادی کے لوگ تو بھگت ہی رہے ہیں، لیکن ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بھی اس جنگی کیفیت میں بداعتمادی، غربت اور افلاس کا شکار ہو رہے ہیں۔

## عبدالغنی لون

شیخ محمد عبداللہ مرحوم کے بعد کشمیر نے صرف عبدالغنی لون کی صورت ہمت اور جرأت کا پیکر







رہنما پیدا کیا تھا۔ ان کا تعلق تحصیل کپواڑہ کے ہڑئی گاؤں سے تھا جو ہمارے حلقہ انتخاب کا گاؤں تھا۔ موصوف پیشہ کے لحاظ سے وکیل اور ایک زمیندار گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیر کی سیاست میں وہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے 1967 کے اسمبلی کے الیکشن میں ہندواڑہ کے حلقہ سے منتخب ہو کر صادق صاحب کی کابینہ میں وزیر مملکت کے طور کام کرتے رہے لیکن بعد ازاں جب میر محمد قاسم نے صادق صاحب کے بالمقابل اپنا گروپ بنایا، اس کے روحِ رواں لون صاحب تھے۔ 1972 کے اسمبلی الیکشن میں دوبارہ منتخب ہو کر میر محمد قاسم مرحوم وزیر اعلیٰ کے ساتھ صحت اور تعلیم کے وزیر بنے جن کے ساتھ میرے قریبی اور گھریلو تعلقات استوار ہو گئے۔ ان کے آبائی حلقہ کرناہ میں، میں ان کا معتمد ترین ورکر تھا، انہوں نے میرے کہنے پر کرناہ میں سکولوں، ہسپتالوں، ڈسپنسریوں کا جال بچھا دیا اور ریوڑیوں کی طرح نوکریاں بانٹیں۔ انہوں نے بحیثیت وزیر کشمیر میں لبریشن فرنٹ کے لوگوں کی بہت مدد کی اور سچی بات یہ ہے کہ انہی کی وجہ سے کشمیر میں لبریشن فرنٹ نے اپنے پاؤں مضبوط کیے۔ وہ نظریاتی طور پر خودمختار کشمیر کے حامی تھے لیکن پاکستان کے لیے بہت ہی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ میں نے اس کتاب میں کسی اور جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے کہ سقوط ڈھاکہ کی خبر ہم نے ایک ملٹری کیمپ میں سنی جس پر انہیں سکتہ طاری ہو گیا اور سرینگر پہنچنے تک وہ روتے گئے۔ مرحوم پاکستان دوبار تشریف لائے جہاں میرے ساتھ ان کا قریبی رابطہ رہا اور میرے پاس دونوں بار تشریف بھی لائے۔

دوسری مرتبہ نومبر 1999 میں پاکستان تشریف لائے، جب انہوں نے اپنے بیٹے سجاد لون کی شادی امان اللہ خان کی بیٹی سے کروائی۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ میں نے ان کو گھر آنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے کہا کہ تمہیں پاکستانی ایجنسیاں تنگ کریں گی۔ ابھی نہیں آؤں گا۔ لیکن اگلے روز مجھے فون کرتے ہوئے بتایا کہ آج رات کو افطاری ہم نے آپ کے ہاں کرنی ہے۔ اس کی تفصیل بھی کسی دوسری جگہ درج ہے۔ ان کے فون کے فوراً بعد آئی ایس آئی کے ایک کرنل میرے پاس آئے کہ جنرل محمود، اس وقت ڈی جی آئی ایس آئی تھے، نے پیغام بھیجا کہ آپ لون صاحب کی دعوت منسوخ کریں۔ میں نے معذرت کی کہ میں ایسا نہیں کر سکتا، آپ خود اس کو منع کریں۔ اس پر وہ لوگ مجھ سے بہت ناراض ہو گئے۔

یہ نومبر کی 24 تاریخ تھی جب وہ افطاری پر میرے گھر آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج آپ کی جنرل مشرف کے ہاں افطاری تھی، آپ وہاں کیوں نہیں گئے۔ انہوں نے کہا کہ میں جنرل مشرف کو یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ منظور گیلانی میرے لیے تم سے زیادہ اہم ہے۔ میرے پوچھنے پر کہ جب پچھلی بار آپ کی ملاقات جنرل مشرف سے ہوئی تھی تو آپ نے کیا تاثر لیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کشمیر کی تحریک کو آپ ہائی جیک نہ کریں، اسے ہمارے پاس رہنے دیں، ہم جو فیصلہ کریں گے وہ پاکستان کے حق میں ہوگا۔ آپ صرف ہماری ممکنہ مدد کریں۔ لون صاحب نے کہا کہ جنرل صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ تو میں نے ان کو جواب دیا آپ ہماری جان چھوڑیں، ہمیں اپنا کام کرنے دیں اور اپنے ملک کو جہادیوں سے بچائیں۔ مرحوم نے کہا کہ جنرل صاحب کے اس سوال پر آپ کے نزدیک کشمیر کا حل کیا ہے؟ میں نے جواب دیا، خودمختار کشمیر، اور اگر صرف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہی فیصلہ کرنا پڑا تو ہندوستان کو اندرونی خودمختاری کے ساتھ ترجیح دوں گا کیوں کہ وہ ایک بڑا سیکولر اور جمہوری اقدار والا ملک ہے۔ یہاں صوبیداروں کی غلامی نہیں کی جاسکتی۔ اس پر جنرل صاحب سیخ پا ہو گئے۔ اسی لیے میں آج ان کی افطاری پر نہیں گیا۔

کشمیر میں 1972 کے اسمبلی الیکشن کے دوران ہم لوگوں نے حلقہ کرناہ میں آزاد امیدوار سید محمد یاسین شاہ کی حمایت کی تھی جو ان کی پارٹی کے خواجہ محمد یونس کے مقابلے میں کامیاب ہو کر پھر لون صاحب کی قیادت میں کانگریس میں شامل ہو گئے تھے۔ بہت دلیر اور بہادر آدمی تھے جو شیخ صاحب کو بھی للکارتے تھے۔ ایک بار اسمبلی میں ان کے داماد غلام محمد شاہ کے کندھے پر سوار ہو کر کہا کہ میں اس طرح اس شیر پر بھی سوار ہوں گا جس طرح اس کاغذی شیر پر سوار ہوا ہوں۔ پاکستان سے واپسی پر وہ دبئی میں ایک کانفرنس میں شریک ہوئے اور اس کے بعد امریکہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر کے سلسلہ میں کوئی مفاہمت ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ان کو کشمیر کی حکومت سونپنے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ لیکن حال ہی میں ہندوستانی را کے سابقہ چیف اے ایس دلت کی کتاب سے پتا چلا کہ شبیر احمد شاہ کو حکومت کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کیوں کہ لون صاحب ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو 21 مئی





2002 کو میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق کی برسی پر شرکت کے بعد نامعلوم[230] بندوق برداروں نے شہید کر دیا۔ ان کے قتل کی ذمہ داری کشمیری مجاہدین، ہندوستانی ایجنسیاں اور پاکستان ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں۔ واللہ علم۔ اس طرح اس چراغ کو گل کر دیا گیا، وگرنہ کشمیر کی تحریک یقیناً نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔

ان کے عسکری گروپ البرق کے لوگوں کے ساتھ ان کے حوالہ سے میری کافی قربت رہی ہے، جن میں فاروق قریشی نمایاں ہیں اور لون صاحب اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ اب کچھ لوگ دوسرے گروپوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ حریت پسند کشمیریوں میں سے اپنی رائے رکھنے اور منوانے والوں میں علی شاہ گیلانی کے علاوہ یہی شخصیت تھے۔ پاکستان میں ان کے سیاسی گروپ کی سید یوسف نسیم نمائندگی کر رہے اور ان کی اہلیہ محترمہ مہر النساء دو بار آزاد کشمیر اسمبلی کے خواتین کی نشست پر ممبر، وزیر اور ایک بار ڈپٹی سپیکر بھی رہیں۔ ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ کشمیر وادی سے پہاڑی بولنے والوں میں سے ہیں جو یہاں اجنبی نہیں لگتے۔ لون کے دو بیٹے بلال اور سجاد کی الگ الگ راہ ہے۔ بلال حریت کا جبکہ سجاد ہندوستان نواز جماعت کا حامی ہے جو 2014 کے الیکشن میں اسمبلی ممبر منتخب ہو کر بی جے پی کی طرف سے ریاست میں وزیر ہے۔ یہ حالات کی سنگینی ہے کہ سجاد لون، عبدالغنی لون کا بیٹا، امان اللہ خان کا داماد، لیکن بی جے پی کا ہمنوا ہے۔

؎ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے!

ان کے بیٹے سجان لون نے Achievable Nationhood کے نام سے کشمیر کے حل کا ایک فارمولا دیا ہے جو جغرافیائی صورتِ حال کو قائم رکھتے ہوئے، سرینگر، مظفر آباد، اسلام آباد اور دہلی کے درمیان مفاہمت کا فارمولا ہے۔

## ایس کے سہنا

2004 میں جب میں کشمیر گیا تو ریاست کے گورنر ایس کے سہنا نے مجھے میرے دوست

بھوشن لعل پنڈت جو گورنر کے پریس انفارمیشن سیکریٹری تھے، کے ذریعہ چائے پر بلایا۔ یہ ہندوستانی فوج کے ریٹائرڈ چیف تھے اور ہمارے علاقے کرناہ میں 104 بریگیڈ کے 1950 کے عرصہ میں بریگیڈیئر رہ چکے ہیں۔ کشمیر کے اخباروں میں میرے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا تھا جس وجہ سے گورنر نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان دنوں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے حوالہ سے سی بی ایم کی بہت گرم جوشی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کچھ ہونے کا امکان ہے؟ ان کا جواب تھا کہ اگر سیاسی بالغ نظری ہو تو کیوں نہیں ہوسکتا لیکن اب پہلے کے مقابلے میں کوئی Break through ہونا مشکل ہے کیوں کہ اس ٹینشن کے مالی فائدے بہت دور تک پہنچ گئے ہیں۔ بات آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دونوں طرف کی آرمی کے علاوہ سول قیادت اور سول سوسائٹی اس پر سیاست کر کے مال کماتی ہے۔ عام لوگوں میں سے کوئی گائیڈ ہے، کوئی سپلائر، کوئی تحفظ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ عام فوجی آر پار آنے جانے والوں کے لیے راستہ مہیا کرتا ہے اور یہ سب کچھ بلا وجہ نہیں ہوتا۔ اس لیے جب بھی یہ مفاد پرست گروپ محسوس کرے گا کہ ان کے اقتصادی مفادات اس سے متاثر ہوں گے تو صرف ایک گولی کے چلنے سے دو ملکوں کی مفاہمت ختم ہو جائے گی۔ یہی بات ریاست کے سابق ڈی جی پولیس علی محمد وٹالی نے اپنی کتاب Intifada میں بہت تفصیل اور حوالوں سے لکھی ہے۔

دسمبر/جنوری 13-2012 میں ایسا ہی ہوا جب ریاست کے دو حصوں کے درمیان تجارت اور آمد و رفت عروج پر تھی، اس مشن پر سول سوسائٹی متحرک تھی۔ پونچھ سیکٹر میں کسی مفاد پرست نے رنگ میں بھنگ ڈال دی جب دونوں طرف سے دو سپاہی مارے گئے اور یہ سارا سسٹم ختم ہو گیا۔ یہ واقع یقینا ہندوستان کی طرف سے ہوا ہوگا کیوں کہ اس کو ہندوستان نے ہی ایکسپلائٹ کیا اور وہ پاکستان پر برس پڑا۔ اندرونی شورش کے بارے میں گورنر نے کہا کہ یہ وادی کشمیر کے اندر صرف کشمیری بولنے والے خطے میں ہے جو سیٹل ہو جائے گا۔ میں نے ان کو کہا، گورنر صاحب کشمیر کی معلوم تاریخ میں یہی حصہ متحرک رہا ہے اور مقابلہ کرتا رہا جو آج تک ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اس پر اس نے کہا کہ اس وقت کی آمریت اور آج کے جمہوری دور میں فرق ہے۔ آج لوگوں کو سنا جاتا ہے، ان کی مشکلات کو attend کیا جاتا ہے،







محرومیوں کو بات چیت سے دور کیا جاتا ہے۔

میری گورنر کے ساتھ میٹنگ سے عام لوگوں کو یہ فائدہ ہوا کہ جن لوگوں کو ان کے عزیزوں کے مجاہدین اور پاکستان سے تعلق کی وجہ سے معہ فیملی ملٹری کیمپ میں صبح سے شام تک حاضر رکھا جاتا تھا ان کی جان بخشی ہو گئی۔ میں نے ان سے اس زیادتی کی شکایت کی تھی۔ واپسی پر پاکستان میں میرے لیے گورنر سے ملاقات کو باعث تعزیر بنا دیا گیا۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

## مفتی محمد سعید

مفتی محمد سعید، مقبوضہ کشمیر بلکہ ہندوستان کی سیاست کے ایک اہم ترین ستون تھے جنہوں نے مقبوضہ کشمیر میں کانگریس کی داغ بیل ڈال کر شیخ محمد عبداللہ مرحوم اور ان کی جماعت نیشنل کانفرنس کا بھرم توڑا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی مقامی جماعت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (PDP) بنا کر کشمیر کے عوام کو مقامی اور قومی سطح پر ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جماعت دراصل مرکزی انٹیلی جینس بیورو کی ذہنی اختراع ہے جس نے شیخ محمد عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس کو حدود میں رکھنے کے لیے بنوایا۔ چوں کہ کشمیر کے لوگ ہندوستان کے قومی دھارے کے خلاف اور مقامی جماعتوں کے حق میں ہیں، اس لیے ان دو جماعتوں نے وہ خلا پُر کیا ہے جو ہندوستان یہاں سیاسی طور پر نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی ہندوستانی پارٹی اب کشمیر میں ان مقامی جماعتوں کی مدد کے بغیر حکومت نہیں بنا سکتی بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ کہ مقامی جماعتیں ہی مرکزی جماعتوں کی اعانت سے کشمیر میں حکومت بناتی ہیں۔

مفتی صاحب کے ساتھ میری شناسائی 1972 میں ہوئی تھی، جب میر محمد قاسم مرحوم نے الیکشن جیت کر کشمیر میں حکومت بنائی تھی۔ اس وقت میں نے اپنے دوستوں کی مدد سے کانگریس کے امیدوار خواجہ محمد یونس کو شکست دلا کر آزاد امیدوار سید محمد یاسین شاہ کو اسمبلی کا ممبر منتخب کروا کر کانگریس کی حمایت کرائی تھی۔ مفتی صاحب مرکز میں وزیر داخلہ اور کشمیر میں دو بار چیف منسٹر بھی رہ چکے ہیں۔ ان

کی پارٹی میں بھی میرے اکثر ہم جماعت اور ہم عصر ہیں۔ مثلاً محمد دلاور میر، مظفر حسین بیگ، حکیم محمد یاسین، محمد رمضان بٹ وغیرہ۔ فی الوقت ان کی جماعت کو ان کی بیٹی محبوبہ مفتی چلا رہی ہیں جو سردار عتیق خان کی طرح متحرک لیکن ان کے برعکس معنی خیز شخصیت ہیں۔ مفتی صاحب بطور وزیر اعلیٰ وفات پا گئے، اب ان کی بیٹی محبوبہ مفتی ان کی جانشین ہے اور کشمیر کی وزیر اعلیٰ ہے۔

میرے 1976 میں پاکستان آنے کے بعد مفتی صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات اگست 2005 میں اس وقت ہوئی جب میں مظفر آباد سرینگر بس کے ذریعے اپنے بچوں کے ہمراہ سرینگر گیا تھا۔ مفتی صاحب نے مجھے اور حکیم یاسین کو کھانے پر اپنے گھر بلایا تھا جہاں ان کی بیٹی محبوبہ بھی تھیں۔ مفتی صاحب اس وقت کشمیر کے چیف منسٹر تھے۔ ان کے ساتھ کھل کر باتیں ہوئیں اور انہوں نے بھی اپنا مافی الضمیر کھل کر بیان کیا، جیسے کہ ہندوستان پاکستان کا کوئی خیر خواہ کہہ سکتا ہے۔ مفتی صاحب نے کچھ اس طرح کی باتیں کیں کہ ''پاکستان نے کشمیر کو حاصل کرنے کے لیے سب حربے آزما کر دیکھ لیے، وہ کسی میں کامیاب نہیں رہا، اپنا ہی نقصان کرایا۔'' انہوں نے کہا کہ وادیٔ کشمیر اور جموں کے مسلم اکثریتی علاقے مین سٹریم میں نہیں رہنا چاہتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان ان کو چھوڑ دے گا، بلکہ ہندوستان کی کوئی پارٹی ان کو الگ کرنا نہیں مانے گی۔ ان کو اکٹھا رکھ کر جموں والے حصے کو تمام ریاست میں اندرونی خودمختاری دی جاسکتی ہے جبکہ پوری ریاست کے لیے ہندوستانی آئین کے تحت سیلف رول لیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے زیر انتظام ریاست کے لوگوں کو معمولی شناخت کرانے پر اِدھر اُدھر آنے جانے اور تجارت کی آزادی اور کشمیریوں کو ہندوستان پاکستان جانے کی آزادی ہونی چاہیے۔ کشمیر کی دولت جس میں جنگلات، معدنیات، پانی وغیرہ کو مشترکہ طور پر pool کیا جاسکتا ہے۔ فوجیں صرف سرحدوں پر ہوں کیوں کہ کشمیر کے اندر جو بھی کوئی واقع ہوتا ہے، اس کی ذمہ داری لوگ فوج پر لگاتے ہیں جس کے ردِعمل کے طور پر تصادم ہوتا ہے اور نقصان لوگوں کا ہی ہوتا ہے اور یہی پالیسی جنرل مشرف کی بھی رہی ہے۔ اس کا ماٹو بھی تقریباً یہی ہے، لیکن اس کو کوئی چلنے نہیں دے گا، کیوں کہ کشمیر کے نام پر ہندوستان اور پاکستان کی ایجنسیاں جو کاروبار کرتی ہیں، وہ ختم ہو جائے







گا۔ جنرل مشرف کی اپنی زندگی بھی دہشت گردوں کے ہاتھ خطرے میں ہے۔ پاکستان میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس کو مضبوط ہونا چاہیے۔ آئینی اصلاحات ہونی چاہئیں تاکہ جاگیرداروں اور وڈیرہ شاہی کے اثر سے لوگ آزاد ہوں۔ ہندوستان پاکستان کے ساتھ ریاست کے سیاست دانوں کو بھی ایک دوسرے سے ملنا چاہیے اور ہم جنرل صاحب سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔ ہماری تجارت بڑھنی چاہیے۔ آنا جانا کھلا ہونا چاہیے۔ بس سروس ہر ایک کے لیے کھلی ہونی چاہیے، محض رشتہ داروں کی حد تک محدود نہ ہو، اس سے دونوں ملکوں کی Face Saving ہوگی اور یہی اس کا حل ہے۔''

دوسری بار مفتی صاحب سے ستمبر 2011 میں ملاقات ہوئی جب میں دوبارہ بذریعہ بس سروس سرینگر گیا تھا۔ اس بار بھی مفتی صاحب نے مجھے کھانے پر گھر بلایا تھا اور ان کے ساتھ کافی تفصیل سے مختلف امور پر بات ہوئی۔ مفتی صاحب، جنرل مشرف کی برطرفی پر خوش نہیں تھے کیوں کہ جنرل صاحب کا پلان اور مفتی صاحب کے سیلف رول فارمولہ میں مکمل آہنگی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگر جنرل رہ جاتا تو اچھا تھا، کم از کم ہندوستان کے ساتھ تعلقات ٹھیک کر دیتا اور یہی پاکستان کے استحکام کی ضمانت ہے۔

تیسری بار ان سے میری ملاقات دسمبر 2012 میں جموں میں ہوئی جب ہمارا ایک وفد Centre for Dialogue and Reconciliation (CDR) کے زیر اہتمام ایک کانفرنس میں گیا تھا۔ مفتی صاحب نے وفد کے چند لوگوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا تھا جہاں کشمیری ضیافت، وازہ وان کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ان میں میرے علاوہ وہ جسٹس عبدالمجید ملک، جسٹس شریف حسین بخاری، ارشاد محمود وغیرہ شامل تھے، جبکہ مفتی صاحب کے ہمراہ مظفر بیگ اور ان کی بیٹی محبوبہ بھی موجود تھیں۔ تنظیم کی ہوسٹ سوشو بھا بھاؤ بھی موجود تھیں۔ یہاں Focused ایشوز پر بات ہوئی اور مفتی صاحب نے تقریباً وہی باتیں دہرائیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ انہوں نے PDP کے Self Rule کو Diccuss کیا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ فاموله پاکستان میں Discuss کیا جائے۔ فارمولہ تقریباً جنرل پرویز مشرف کا سیلف رول فارمولہ ہی ہے، جس کے تحت ریاست کے دونوں حصوں میں آمد و رفت شناختی دستاویز پر ہو، فوجیں صرف سرحد تک رہیں، مشترکہ مفادات کے معاملات ریاست کے دونوں حصے کے لوگ، باہمی

اشتراک سے چلائیں جس کو ریاست کے دونوں حصوں اور ہندوستان پاکستان کے نمائندے پر مشتمل ایک Greater Council ان معاملات کو Regulate کرے، ریاست کے دونوں حصے اپنے اپنے ملک کی حکمرانی میں رہیں، لیکن دونوں حصوں میں آمدورفت معمول کے مطابق ہو جس سے کسی بھی ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر بھی حرف نہ آئے۔

سیلف رول کا فارمولہ تقریباً مشرف والا ہی فارمولہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مشرف کے فارمولا کے تحت یہ انتظام پندرہ سال تک ہونا تھا جس کے بعد اس پر نظرثانی کی جاسکتی ہے۔ اس فارمولہ سے پورے کشمیر پر پاکستان کا کلیم تو ختم ہو جاتا ہے لیکن پاکستان کے زیرانتظام کشمیر کے حصوں پر پاکستان کے کلیم کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس پر ہندوستان کے موقف کے مغائر، پاکستان کا حق حکمرانی تسلیم کیا گیا ہے جو ہندوستان کی مرکزی دھارے کی جماعتوں کی طرف سے اچھا شگون ہے، کیوں کہ مقبوضہ کشمیر اور ہندوستان کا آئین تو پاکستانی زیرانتظام کشمیر کو بھی ہندوستان کا حصہ مانتا ہے اور یہی بھارت کی پارلیمنٹ کی 1994 اور اب 2013 کی متفقہ قرارداد بھی ہے۔ اس فارمولہ سے دونوں طرف منقسم خاندانوں اور کاروباری لوگوں کو وقتی ریلیف ملتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حریت کانفرنس میں گیلانی صاحب کے بعد، مفتی صاحب نے زیادہ دیانت داری سے کام لیا ہے جن کے ساتھ رابطہ رکھنا بہرحال ریاستی مفاد میں ہے۔ گیلانی صاحب کا موقف سلامتی کونسل کی قراردادوں کے عین مطابق اور مفتی صاحب کا عملی صورتِ حال کو بہتر بنا کر تسلیم کرنا ہے۔ ان کی پارٹی میں فعال ترین ان کی بیٹی محبوبہ مفتی ہیں جو متحرک اور نڈر سیاست دان ہیں اپنے باپ جیسے خیالات رکھتی ہیں۔ مفتی صاحب کی موجودگی کے علاوہ 2014 کے جولائی اور 2015 مئی میں بھی میری ان کے ساتھ دلاور میر کی موجودگی میں کافی دیر تک میٹنگ رہی اور باتیں ہوئیں۔ جو اپنے آپ کو ہندوستانی ہونے پر فخر کرتی ہیں لیکن ریاست کی خودمختاری اور پاکستان کے زیرانتظام علاقوں پر پاکستان کا حق سمجھتی ہیں۔ محبوبہ نے کہا، الیکشن ہونے والا ہے، پاکستان کو اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے اور نہ علیحدگی پسندوں کو اس پر مجبور کرنا چاہیے تاکہ عام لوگ بغیر کسی دھمکی کے اپنے نمائندے منتخب





کر سکیں۔ 2013 کے پارلیمنٹ کے الیکشن میں انہوں نے وادی کی 230 ساری نشستیں حاصل کیں جبکہ 2014 کے مقامی اسمبلی کے الیکشن میں 79 ممبران کی اسمبلی میں 28 نشستیں حاصل کر کے بی جے پی کے ساتھ جو دوسری بڑی پارلیمانی پارٹی کے طور سامنے آئی، مل کر حکومت بنائی۔ بی جے پی کی سخت گیری کے باوجود اس سے کشمیریت اور پاکستان کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کی شرائط منوائیں۔ کشمیر کی کوئی دوسری مقامی جماعت ایسا نہیں کر سکتی گو کہ بی جے پی ان شرائط پر پورا نہیں اتری۔

2015 مئی میں جب میں سرینگر گیا تھا، اس وقت بھی مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی جو بی جے پی کی شراکت کی وجہ سے زیادہ خوش نہیں تھے لیکن ایسا کرنا اپنی مجبوری بتایا۔ انہوں نے میاں صاحب کے بارے میں کہا کہ ان کو فوج کے ساتھ مل کر چلنا چاہیے کیوں کہ پاکستان میں فوجی کردار کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اس لیے اس کو Regulate کرنے کی ضرورت ہے۔ عمران خان اور طاہر القادری کے دھرنوں اور ایم کیو ایم کی مجرمانہ سرگرمیوں پر بہت برہم تھے۔ کشمیری لوگ مفتی صاحب کے بی جے پی کے ساتھ حکومت بنانے پر خوش نہیں تھے۔ مفتی صاحب ایک بھرپور سیاسی زندگی گزارنے کے بعد 7 جنوری 2016 کو نیو دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔ عجب آزاد مرد تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیٹی محبوبہ مفتی کو بی جے پی کی مخلوط حکومت میں وزیراعلیٰ منتخب کیا گیا جو ان کی سیاسی جانشین اور پارلیمنٹ آف انڈیا کی ممبر بھی منتخب ہو چکی ہیں۔ مفتی صاحب اور ان کی جماعت کشمیر میں بی جے پی کے قانونی اور آئینی قدم گاڑنے کے مجرم ہیں۔

# حصہ دوم - آزاد کشمیر/ پاکستان

## سردار محمد عبدالقیوم خان

آزاد کشمیر میں آباد ہونے کے بعد میرا جن لوگوں سے واسطہ پڑا، ان کے سیاسی کردار، ان کی فکر کا ذکر کیے بغیر میں اس کتاب کو مکمل نہیں سمجھتا۔ آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت میں سے سیاسی اور سرکاری اقتدار پر سب سے زیادہ اور سب سے لمبا عرصہ سردار عبدالقیوم مرحوم فائز رہے۔ اور اب ان کی تیسری نسل تیار ہوگئی ہے۔ ایک ریٹائرڈ فوجی کے بیٹے اور خود بھی فوجی ہونے کے لحاظ سے پاکستان کی سیاست میں فوج کے اثر کی وجہ سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا کیوں کہ ان کو علم تھا کہ فوجیوں کو کس طرح رام کر کے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ زندگی بھر فوجیوں کے بل بوتے پر ہر لحاظ سے کشمیر کی سیاست پر قابض رہے۔ کسی یونیورسٹی یا معیاری سکول کے پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن کثیر المطالعہ ہونے کی وجہ سے فی زمانہ علوم سے کما حقہ، واقفیت رکھتے تھے اور بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگوں کو مطمئن کر دیتے تھے، نئی نئی باتیں سیکھنے کا شوق اور جدید علوم سے بہرہ ور رہنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اگر کوئی نئی بات سنتے تو اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ ہر مشکل انگریزی، اردو، فارسی یا عربی لفظ کے معنی ڈکشنری سے سمجھتے اور پھر اس کو استعمال کرتے تھے۔ فی الواقع ایک طالب علم تھے۔

مسئلہ کشمیر کے بین الاقوامی حیثیت کی وجہ سے کشمیر کے پاکستانی حصے میں ان کو دنیا بھر کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا جس وجہ سے بین الاقوامی سیاست بھی اچھی طرح سے جانتے تھے اور







پاکستان کی فوج کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے پاکستان بھر میں اثر ورسوخ کے حامل رہے ہیں۔ آزاد کشمیر میں کئی بار وزیر، صدر اور وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ 1970 کے براہ راست الیکشن میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کے علاوہ دو بیرسٹروں کو بھی شکست دی ہے۔ کشمیر کی متنازع حیثیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کے ضیاالحق کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں، اس کا فائدہ آزاد کشمیر کو ملنا چاہیے تاکہ مرکز میں اس کا حکومت اور پالیسی ساز میں کردار ہو۔ انہوں نے کہا، ''ایسا ہی اچھا ہے، کبھی ہم اوپر، کبھی وہ اوپر۔'' وہ شیخ عبداللہ مرحوم کے نقش قدم پر چلتے تھے، اس کی تقلید میں راولپنڈی میں اپنے گھر کا نام مجاہد منزل رکھا ہے جو شیخ صاحب کا سرینگر میں ہے۔ پاکستان کی سیاست میں آزاد کشمیر میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کی حد تک شامل رہے اور اکثر کہا کرتے ہیں کہ پتھر اپنی جگہ پر بھاری ہوتا ہے۔ سردار صاحب ہمیشہ پڑھے لکھے اور تجربہ کار لوگوں کو اپنے مصاحبین میں شامل رکھتے تھے ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے اور اس کو احساس دلاتے کہ وہ شخص بہت اہم ہے۔ چسٹرٹن جو ایک انگریز رائٹر تھا، کے مطابق، بڑا آدمی وہ نہیں، جو ہر آدمی کو یہ احساس دلائے کہ وہ چھوٹا ہے بلکہ حقیقی معنوں میں بڑا آدمی وہ ہے جو ہر ایک کے اندر بڑائی کا احساس پیدا کرے۔ یہ خوبی سردار صاحب کا خاصا تھی۔

آزاد کشمیر آنے کے بعد میرا سب سے زیادہ واسطہ ان ہی سے رہا کیوں کہ میرے خاندان کے اکثر لوگ ان کی جماعت مسلم کانفرنس میں شامل تھے۔ ان کے بیٹے سردار عتیق احمد خان کے ساتھ میرے بھائیوں کے قریبی تعلقات رہے جس وجہ سے مجھے ان کے بہت قریب ہونے کا موقع ملا۔ 1982 جب سے میں نے ان کی جماعت میں شمولیت اختیار کی 1993 تک، ان سے اتنا قریب رہنے کا موقع ملا جتنا ان کے بھائی یا بیٹوں کو تھا۔ مجھ پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اس زمانے میں ان کے لیے لکھنے پڑھنے کا اکثر کام میں کیا کرتا تھا۔ وہ اکثر پرانے واقعات دہرایا کرتے تھے اور اپنی سرگرمیوں کے چسکے لے لے کر قصے سنایا کرتے تھے۔ چوہدری غلام عباس مرحوم جو مسلم کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے، سردار صاحب ان کے بہت ہی مداح اور مقلد تھے۔ چوہدری صاحب کے بارے میں کشمیر

میں جو واقعات میں نے سنے تھے، اس کے برعکس یہاں سنے، اس لیے چوہدری صاحب کے بارے میں آج تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا کیوں کہ میں نے خود ان کو نہ کبھی دیکھا اور نہ ہی مجلس کی۔ البتہ جموں اور کشمیر والوں کی تاریخی رقابت کے حوالے سے میرا اندازہ ہے کہ ان کے بھی کشمیر والوں کے بارے میں جذبات ویسے ہی ہوتے جیسے باقی جموں والوں کے۔ جموں والوں سے رقابت کی خصوصی وجوہات میرے خیال میں جموں کے ڈوگروں کا کشمیر پر قبضہ، زبان کا فرق، جموں والوں کا حکمران خاندان کی سرزمین سے تعلق کی وجہ سے اپنے آپ کو حاکم سمجھنا وغیرہ۔ چوہدری صاحب کی سیاسی میراث سردار قیوم صاحب کو ملی جس وجہ سے سردار صاحب بھی وادی کے کشمیریوں کے بارے میں تحفظات رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی دنوں کی حکومت میں کئی نامور کشمیری دانشور پیش بیک ہوئے یا پاکستان میں آباد ہو گئے۔ ان کی وضع قطع، گفتگو اور اندازِ بیان مسحور کن تھا۔

میں 1985 کے الیکشن کے سلسلہ میں ضلع مظفر آباد جو کہ آزاد کشمیر کا نصف حصہ ہے، کے ہر حلقے اور راولپنڈی اسلام آباد میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ آزاد کشمیر میں حیات خان کی حکومت نے سب سیاست دانوں کو بہت Tough time دیا اور سیاست دانوں کو گھر سے نکل کر عوام کی دہلیز تک پہنچنے کے لیے مجبور کیا۔ ایک دن ہم لوگ ضلع نیلم کے ہلمت علاقے میں تھے تو سردار صاحب پیدل چڑھائی، اترائی چل کر تنگ آئے اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے، ''اس سوری دے (حیات خان) نے خوار کیتا۔'' یعنی حیات خان نے ان کو گھر سے نکالا، وگرنہ لوگ گھر آ کر حمایت کی یقین دہانی کراتے تھے۔ ان دنوں آزاد کشمیر میں جنرل عبدالرحمان کی حکومت قائم ہونے کی وجہ سے ان کو کافی آسانیاں میسر آ گئی تھیں کیوں کہ مرکز میں سردار صاحب کے جنرل ضیاالحق کے ساتھ تعلقات ٹھیک ہو گئے تھے۔ مقامی سطح پر جنرل عبدالرحمان کو سردار صاحب نے یقین دہانی کرائی تھی کہ الیکشن کے بعد ان کو صدر بنایا جائے گا، اس لیے مقامی انتظامیہ ساری سردار صاحب کے ڈسپوزل پر تھی۔ میں نے سردار صاحب سے پوچھا کہ آپ نے ان سے یہ وعدہ کیوں کیا جبکہ آپ کی جماعت میں سکندر حیات بھی ہیں؟ ان کا جواب تھا کہ میں کہاں بنانے والا ہوں۔ جو جماعت فیصلہ کرے گی وہی ہوگا۔ تو پھر ایسا کیوں کہا؟ میں نے پوچھا۔







ان کا جواب تھا کہ بات وہ کرنی چاہیے جس سے دوسرا خوش ہو اور کام وہ کرنا چاہیے جس سے اپنا فائدہ ہو۔ لوگ بھول جاتے ہیں، اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔

وہ حس مزاح بھی خوب رکھتے تھے۔ 1988 میں میری ایک کتاب کی تقریب رونمائی پر حاضرین میں سے کسی شخص کو بار بار چپ رہنے کا کہنے کے باوجود وہ باز نہ آیا تو سردار صاحب نے اس کو کہا، ''الو کا پٹھا، بیٹھ جاؤ۔'' پھر معذرت کر کے کہنے لگے، گالی دینے کے بغیر بات کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ وہ مذاق برداشت بھی کرتے تھے۔ مظفر آباد کے سید غلام حسین شاہ نامی ایک ورکر کو انہوں نے کہا، شاہ جی لوگ آپ کو فراڈ شاہ کیوں کہتے ہیں؟ اس نے برجستہ جواب دیا کہ جناب آپ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے۔ اپنے کارکنان کی تلخ ترین بات سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ایک دن ان کے ایک پرانے کارکن چاچا قریش محمد نے ان سے اپنی بیٹی کو لیکچرر لگانے کی درخواست کی جس پر سردار صاحب نے کہا، میرٹ پر لگے گی۔ اس نے جواب دیا یہ تو ایم اے ہے اور یہی میرٹ ہے۔ ہم لوگ سلطان محمود اور سردار ابراہیم خان جو بیرسٹر ہیں، کے مقابلے میں اَن پڑھ آدمی کو لیڈر مانتے ہیں، کیا ادھر میرٹ نہیں ہونا چاہیے؟ سردار صاحب نے اسے کہا کہ سکندر حیات وزیراعظم اور راجہ اکرم وزیر تعلیم ہیں اور راجپوت ہیں، ان سے کہو۔ اس نے جواب دیا، میری طرح کے راجپوت ہوتے تو کہتا۔ وہ پرائیویٹ یعنی نقلی راجپوت ہیں، اس لیے آپ کے ساتھی ہیں۔ اس پر محفل خوشگوار ہو گئی۔

یہ غالباً 1988 کی بات ہے کہ سردار صاحب نے مظفر آباد سپریم بلڈنگ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہر طبقے کے انصاف کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ ایک سیاستدان کے لیے ہزاروں لوگوں کو مار دینا بھی انصاف ہے جبکہ ایک جج کے لیے ایک جان کے قاتل کو سزا دینا انصاف ہے۔ اسی اجلاس میں کہا کہ سیاست میں شیطان سے بھی اتحاد کرنا ناجائز نہیں۔ ان کا بیٹا سردار عتیق احمد خان بھی اس فلسفے پر چلتا ہے۔ کبھی فوج کے ساتھ، کبھی پی پی پی اور کبھی مسلم لیگ کے ساتھ۔ پاکستان کی سیاست میں جو مضبوط نظر آتا ہے، اس کے ساتھ وابستگی پیدا کرتا ہے اور ہراول دستے کے طور اپنے کسی معتمد کو شامل کر دیتے ہیں۔ عمران خان کی تحریک انصاف میں بھی ہراول دستہ کے طور پر اپنے کچھ

لوگوں کو شامل کرادیا ہے۔ عتیق خان خود بھی عمران خان اور مولانا طاہر القادری کو اپنی حمایت کی یقین دہانی کرا چکے ہیں۔ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کے ماتمی جلوسوں اور حافظ محمد سعید کے ہر اول دستے میں بھی شامل رہتے ہیں۔ 2016 کے اسمبلی ایکشن میں عمران خان کی تحریک انصاف کے اتحادی جبکہ زبانی غیر ریاستی جماعتوں کے خلاف اور ملٹری ڈیموکریسی کے پرچارک ہیں۔

جب آزاد کشمیر میں 1985 کے الیکشن کے بعد مسلم کانفرنس کی حکومت بننے کے پراسس میں تھی، سردار صاحب کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ وہ وزیر اعظم بنیں لیکن سردار سکندر حیات کی اس سلسلے میں لابی مضبوط تھی، وہ وزیر اعظم بننے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی آپس میں بہت ٹھن گئی۔ میں اس معاملے میں غیر جانب دار رہا۔ گو کہ میری خواہش تھی کہ سکندر حیات ہی وزیر اعظم بنیں لیکن میں نے سوائے اس کے کوئی اور کردار ادا نہیں کیا کہ میں مسلم کانفرنس کا چیف الیکشن ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے اس کے امیدواروں کی طرف سے یا ان کے خلاف ہونے والے مقدمات کی پیروی کرتا رہا جس وجہ سے سکندر حیات خان نے مجھے ایڈووکیٹ جنرل بھی تعینات کیا۔ سردار صاحب کی خواہش تھی کہ سردار رفیق محمود جو مجھ سے پہلے ایڈووکیٹ جنرل تھے، ہی فائز رہیں کیوں کہ سردار ابراہیم صاحب مرحوم کی یہ خواہش تھی اور سردار قیوم صاحب ان کی خواہش کو ٹالنے کے روادار نہیں تھے۔ حالاں کہ میں نے ان کی حکومت بنانے میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا جس کی وجہ سے سردار گل خنداں اور عبداللطیف سلہریا کی حمایت ان کو حاصل ہوئی۔

اسی عرصہ کے دوران ملک عبدالمجید صاحب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے اور دونوں سردار اُن کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ملک صاحب کے خلاف ریفرنس دائر کر کے ان کو عہدے سے ہٹایا جائے لیکن باقی لوگوں کے علاوہ میں نے بھی اس کی مخالفت کی۔ تاہم ان کو ہائی کورٹ کے چیف شپ سے ہٹا کر سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج مقرر کیا گیا۔ مجھے سردار صاحب نے ملک صاحب کے پاس یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا تا کہ وہ باخبر ہو جائیں اور سکندر حیات کے خلاف کوئی ردِعمل کریں۔ حالاں کہ یہ دونوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔







1987 کے بلدیاتی الیکشنز میں مسلم کانفرنس کی طرف سے چند این ایس ایف اور لبریشن فرنٹ کے نوجوانوں کی الیکشن میں بھرپور سپورٹ کی گئی۔ میں نے سردار صاحب کو کہا کہ یہ لوگ تو غیر جماعتی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ہمارے کام کے لوگ ہیں، ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ سردار صاحب اکثر یہی کہتے تھے کہ ان لوگوں کی وجہ سے ان کو، یعنی سردار صاحب کو تقویت ملتی ہے۔ اس لیے سردار صاحب ان کی مالی اعانت بھی کیا کرتے تھے اور جو بات خود نہ کرنا چاہیں، ان کے ذریعہ کروا کر حکومت پاکستان کو یہ باور کراتے تھے اگر ان کی جماعت نہ ہوتی تو ان نیشنلسٹوں نے تباہی مچا دی ہوتی۔ امان اللہ خان صاحب بھی ان کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ مین سٹریم جماعتوں میں سے ہمارے قریب ترین اور خیال رکھنے والے سردار قیوم ہی ہیں۔ کے ایچ خورشید صاحب مرحوم اکثر کہا کرتے تھے، سردار عبدالقیوم خان مجھ سے زیادہ خود مختاری ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان مرحوم نے 1979 میں مظفر آباد بار ایسوسی ایشن میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا خورشید خان نظریات کی اور قیوم خان مفادات کی سیاست کرتے ہیں۔ اس کی سچائی اس حقیقت سے عیاں ہے کہ سردار صاحب پاکستان کی جماعتوں کے آزاد کشمیر میں یہ کہہ کر مخالفت کرتے رہے کہ یہ غیر ریاستی جماعتیں ہیں، لیکن الیکشن ان کی اعانت سے لڑتے اور حکومت کرتے تھے۔

1990 میں، میں نے سردار سکندر حیات سے اختلاف کی وجہ سے ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دیا۔ ان دنوں مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت بن گئی تھی اور ادھر دو سرداروں میں بھی جنگ جاری تھی۔ میں نے دوبارہ وکالت شروع کر دی۔ ایک روز شمالی علاقہ جات کے حوالہ سے سردار صاحب سے بات ہو رہی تھی، جہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ میں نے کہا کہ کشمیر کی تاریخ اور آئین کے حوالہ سے شمالی علاقہ جات کو آزاد کشمیر میں شامل ہونا چاہیے تھا اور کراچی معاہدہ آئین کے مغائر ہے۔ اس پر سردار صاحب نے مجھے کہا کہ اس کے خلاف رٹ دائر کریں۔ میں نے ان سے بھی وکالت نامہ پر دستخط لیے جو انہوں نے بخوشی کر دیئے، لیکن بعد ازاں کہا کہ میری طرف سے رِٹ نہ کریں، لیکن دائر ضرور کریں۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن جب فیصلہ ہوا تو ملک مجید صاحب پر چڑھ

دوڑے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا اور اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کروادی۔ اس وقت سردار صاحب وزیر اعظم بن گئے تھے۔

1991 میں جب آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی لیکن صدر بدستور سردار صاحب ہی تھے، ان کی تجویز پر میری مستقل اور ریاض اختر صاحب کی ایڈہاک جج ہائی کورٹ کے عہدے پر تقرری کی منظوری حکومت پاکستان نے دی۔ ریاض اختر صاحب کا نام آزاد کشمیر کے دونوں چیف جسٹس صاحبان نے تجویز نہیں کیا تھا جو لازمی امر تھا۔ لیکن سردار صاحب نے فائل پر لکھا کہ میں نے اس وقت کے چیف جسٹس صاحبان سے مشورہ کر لیا تھا، جبکہ دونوں چیف جسٹس صاحبان سردار اشرف اور راجہ خورشید خان نے اس سے لاعلمی اور لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ریاض اختر صاحب کی تقرری کا نوٹیفیکیشن پیپلز پارٹی کی حکومت نے جاری کر دیا لیکن میرا نہیں ہوا۔ سردار صاحب نے اس کو بہت برا منایا کہ ریاض اختر نے ان لوگوں کے ساتھ سودا بازی کر لی ہے۔ اس پر بحیثیت صدر انہوں نے ان کی تقرری کے نوٹیفیکیشن کی منسوخی کا حکم جاری کیا جس پر حکومت نے عملدرآمد نہیں کیا۔

سردار صاحب کے مشورے پر ریاض اختر کی تقرری کو چند وکلاء نے ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جس کی پیروی عبدالرشید عباسی اور راجہ حنیف صاحب نے سردار صاحب کے کہنے پر کی۔ جب 1991 میں سردار عبدالقیوم صاحب علماء مشائخ کی نشست پر ممبر اسمبلی منتخب ہونے کے بعد وزیر اعظم آزاد کشمیر بنے تو ان کے انتخاب کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ان دنوں گرمائی تعطیلات تھیں اور میں ویکشن جج تھا۔ کیس میرے پاس لگا۔ سردار صاحب نے سیاب خالد، الطاف کیانی مرحوم، ممتاز گیلانی مرحوم اور ناہید طارق کو میرے پاس بھیجا کہ ان کے خلاف رِٹ کو ابتدائی سماعت پر خارج کریں۔ لیکن میں نے ان کو کہا کہ اس میں اہم آئینی اور قانونی نکات اٹھائے گئے ہیں جس کے پس پشت پوری اپوزیشن ہے، ایسا کرنا مصلحت اور آئین کے تحت ممکن نہیں ہے۔ میں نے مقدمہ تعطیلات کے بعد فل بنچ بنانے کے لیے چیف جسٹس کے پاس بھیج دیا۔ مقدمہ بجائے فل بنچ کے ملک عبدالمجید صاحب سے ریاض اختر کے پاس فکس کروالیا جنوں نے مبینہ طور بابر اعوان ایڈووکیٹ کے لکھے ہوئے فیصلے پر دستخط کر کے رِٹ





ابتدائی سماعت کے بعد ہی خارج کر دی۔ جب ریاض اختر کے ایڈہاک جج 230 کی مدت ختم ہوئی تو ان کو اس خدمت کے عوض شریعت کورٹ کے قانون میں ترمیم کر کے جج ہائی کورٹ کے برابر مراعات دے کر شریعت کورٹ کا جج لگا دیا۔ اس کے بعد اسی طریقے سے شریعت کورٹ کے ججز لگانے کی روایت پڑ گئی۔ اب تو ہر حکومت اپنے ورکرز کو نوازنے کے لیے ہائی کورٹ کے جج کی مراعات دے کر شریعت کورٹ کے ججز لگانے کی تاک میں لگی رہتی ہے۔

انہوں نے تحصیل اور ضلعی سطح پر مولویوں کو تحصیل اور ضلع قاضی بنا کر صاف شفاف طریقے سے یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل ججوں کے برابر عدالتی اختیار دے کر جوڈیشل سسٹم کو اسلام کے نام پر کنٹرول کیا۔ انتظامیہ میں اپنے من پسند لوگوں سے اپنا کام کرواتے تھے اور عدالتوں سے بھی سیاسی طریقے سے کام لینے کی ابتدا کی۔ اب خدا خدا کر کے یہ سسٹم ڈگر پر آ گیا ہے۔ یونیورسٹیوں، بالخصوص اسلامی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل لوگوں کے قاضی بننے سے اس ادارے کا وقار و جود میں آ رہا ہے۔ گو کہ یہ ایک فضول مشق ہے کیوں کہ معمولی نوعیت کے فوجداری معاملات کی سماعت پر بھی دو لوگوں کا وقت ضائع ہوتا ہے اس کو یک رکنی عدالت بنا دینا چاہیے۔ اور تحصیل قاضی کے لیے بھی وکالت کی شرط رکھنی لازمی ہے کیوں کہ ضابطہ سے واقفیت کے بغیر انصاف کے تقاضے پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔

سردار صاحب کی حکومت کے دوران سردار عتیق خان نے تقریباً چار سو ساٹھ کے قریب مسلم کانفرنس کے ورکرز کی مختلف عہدوں پر ایڈہاک بنیادوں پر تقرری کی جس کے بعد میں اسمبلی سے ایکٹ کے ذریعہ کنفرمیشن کی گئی۔ اس قانون کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس قانون کے تحت کنفرم ہونے والے مختلف محکموں کے ملازمین کی تقرری کو الگ الگ بھی چیلنج کیا گیا۔ اس قانون کو ملک عبدالمجید صاحب چیف جسٹس نے آئین اور بنیادی حقوق کے خلاف قرار دے کر کالعدم قرار دیا جبکہ سوشل ویلفیئر، محکمہ صحت اور جنگلات میں بھرتی کیے گئے ملازمین کی تقرری کے خلاف مقدمہ کی سماعت میں نے کر کے ان کی تقرریوں کو کالعدم قرار دیا۔ میرا چوں کہ تعلق مسلم کانفرنس سے رہا تھا اور سردار صاحب کی صدارت کے عہدے کے دوران ان کی تجویز پر میری تقرری بھی ہوئی تھی، اس کے علاوہ ان

لوگوں کے ساتھ میرے گہرے تعلقات بھی رہے تھے، اس لیے میرے ہاتھوں مقدمہ کا ان کے خلاف فیصلہ ان لوگوں کو بہت ناگوار گزرا۔

ایک دن سردار قیوم صاحب مجھے اپنے ساتھ ایبٹ آباد لے گئے اور ان مقدمات کے فیصلہ کی نسبت شکایت کی۔ میں نے ان سے کہا کہ سردار صاحب آپ انصاف اور اسلام کے دعویدار ہیں، آپ کو یہ ناانصافی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اگر میرٹ پر آپ کے ورکرز کے علاوہ باقی لوگ بھرتی ہوجاتے، وہ بھی ریاستی باشندے ہوتے اور آپ کی نیک نامی بھی ہوتی۔ سردار صاحب کی یہ خوبی رہی ہے کہ ہر معقول بات کو ایک دم مان لیتے تھے اور اپنا فیصلہ بدل لیتے تھے۔ لیکن اگر ان کی فیملی کا کوئی شخص بالخصوص بیٹے یا بھائی عبدالغفار خان مرحوم آڑے آجاتے تو اپنے غلط فیصلہ کے حق میں بھی ناقابل تردید دلائل پیش کردیتے۔

کشمیر کی 1990 کے بعد کی مسلح تحریک کے دوران جو کشمیری ہجرت کرکے پاکستان آئے، ان کی سردار صاحب نے بلاشبہ سیاسی، مالی، اخلاقی اور ہر طرح سے مدد کی۔ یہ ان کی مجبوری بن گئی تھی کیوں کہ پاکستان کی فوج ان کی بھرپور مدد کرتی تھی اور یہ ان کی پالیسی کا حصہ تھا۔ سردار صاحب نے ان کی مدد کرکے کئی گنا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے فوج کی مدد کرکے اس کا بھرپور اعتماد حاصل کیا۔ ہندوستانی کشمیر کے اندر اپنا نام بنایا اور جو مہاجرین واپس جاتے تھے۔ وہ ان کے بارے میں اچھے جذبات لے کر جاتے تھے۔ عتیق خان کا اثر رسوخ بڑھایا اور کشمیر کے نام پر دنیا بھر میں اپنا تعارف کروایا۔

کشمیر کا جہاد ہندوستان، پاکستان اور کشمیریوں کے علاوہ دنیا کی کئی تنظیموں کے لیے سونے کی کان بن گیا اور اب اس کے اتنے اقتصادی فائدے اور مواقع پیدا ہوگئے ہیں کہ اس تحریک کو کوئی ختم نہیں ہونے دے گا۔ سردار صاحب کی اس عرصہ کے دوران پاکستان کی فوج کے ساتھ اتنی قربت پیدا ہوگئی کہ خود کو دوسری بار صدر اور 2006 میں عتیق خان کو وزیراعظم بھی بنوایا۔ جنرل مشرف ان کو جس طریقے سے چاہتا استعمال کرتا بلکہ مشرف کے چار نکاتی کشمیر فارمولہ کو پاکستانی لیڈروں میں سے صرف





سردار قیوم صاحب اور ان کے بیٹے نے جلا بخشی۔ سردار صاحب نے یہ فلاسفی[230] بھی پیش کی تھی کہ سیاست دانوں کو ان کے قد کاٹھ کے مطابق فوجی رینک دیئے جائیں۔ اس فلاسفی کے پس منظر میں عتیق احمد خان ملٹری ڈیموکریسی کا پرچار کرتا ہے۔ بھلا ہو جنرل اشفاق پرویز کیانی کا جس نے فوج کو سیاست سے اور سیاست دانوں کو فوجی مدد سے سیاست کرنے کا دروازہ بند کردیا۔ جنرل راحیل شریف بھی اس روش پر گامزن رہے اور یہی فوج اور ملک کے حق میں بہتر ہے۔

آزاد کشمیر کی کوئی بھی تاریخ سردار قیوم صاحب کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اگر آزاد کشمیر کے سارے لیڈر اچھے ہیں تو سردار صاحب سب سے اچھے تھے۔ انہوں نے زبانی جمع خرچ کرکے گلگت بلتستان کو بھی آزاد کرانے کا سارا سہرا اپنے سر سجا رکھا۔ اپنے آپ کو مجاہد اوّل بنوایا، نیلہ بٹ نامی ایک پہاڑ کی چوٹی کو جہاد کا مرکز بنوایا وغیرہ۔ یہ ان کی لیڈرشپ کی کوالٹی تھی۔ سردار صاحب کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ وہ آزاد کشمیر میں برادری ازم کی وبا سے بالاتر تھے۔ سردار صاحب جب تک عتیق احمد خان کے زیر اثر نہیں تھے، بہت دبنگ طریقے سے حکومت پاکستان کے سامنے ڈٹ جاتے تھے۔ 1990 سے پہلے ان کے حکومت میں ہوتے ہوئے کیا مجال کبھی کوئی مرکزی عہدے دار ان کی مرضی کے خلاف آزاد کشمیر میں تعینات کیا گیا؟ 1992 میں جب پاکستان میں ججوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تو آزاد کشمیر میں ججوں کی تنخواہ باقی صوبوں کے مقابلہ میں دوسو روپے کم رکھی گئی جس پر سردار صاحب نے خصوصی الاؤنس کے ذریعہ ان کی تنخواہ میں پاکستانی ججوں کے مقابلے میں ایک ہزار روپے کا اضافہ کیا اور آئین میں ترمیم کروا کر اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی تنخواہ مراعات باقی ملک کے ججوں کے برابر کی گئی۔ اس سے قبل 1970 کی حکومت میں آزاد کشمیر کے ملازمین کی تنخواہ و مراعات کو پنجاب کے برابر کیا تھا۔ یہ ان کے قد کاٹھ کا عالم تھا جو بدقسمتی سے بتدریج کم ہوتا گیا۔ راجہ فاروق حیدر خان میں مجھے یہ خوبیاں نظر آتی ہیں لیکن اس کے لیے اس کو بہت بڑی قربانی دینا پڑے گی، سنجیدگی اور پختگی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔

میرے پاکستان میں ہوتے ہوئے سردار عبدالقیوم صاحب 1985 سے 1990 تک صدر 1991 سے 1996 تک وزیراعظم 1996 سے 2001 تک دوبارہ صدر رہے، ان کو مسلم کانفرنس

کے لوگ مجاہد اوّل کے نام سے پکارتے ہیں۔ 2006 کے بعد شدید خواہش کے باوجود میں سردار صاحب سے نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے میرے خلاف صدر، وزیراعظم پاکستان، چیف آف آرمی سٹاف، چیئرمین جوائنٹ سٹاف، آئی ایس آئی اور آئی بی کے سربراہ کو خط لکھ کر الزام لگایا کہ منظور گیلانی کی سرگرمیوں سے پاکستان کو اتنا نقصان پہنچا ہے جتنا ہندوستان کی ایجنسیاں 60 سال میں نہیں پہنچا سکیں۔ یہ خط ضمیمہ کے طور شامل ہے۔ میں نے اپنے خلاف خط پڑھنے کے بعد سردار صاحب کو فون کیا اور یہ بات کہی لیکن وہ ٹال گئے۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ یہ دن دیکھنے کے لیے مجھے زندہ رہنا پڑا کہ آپ جیسا بڑا آدمی ایسی حرکت کرسکتا ہے۔ اس کے بعد میرا ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ میں ان کو اس بات پر معاف تو کرسکتا ہوں لیکن یہ بات بھول نہیں سکتا۔

زندگی کے آخری چند ہفتے سردار صاحب جناح ہسپتال اسلام آباد میں صاحب فراش رہے۔ ایک روز میں ان کی عیادت کے لیے ہسپتال گیا لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میں اس کے بعد امریکہ چلا گیا اور اس عرصہ کے دوران وہ 10 جولائی 2015 کو اسلام آباد میں اس جہانِ فانی سے ایک بھرپور کردار ادا کرکے رحلت فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب کرے۔ آمین۔

مجھے نہیں لگتا کہ ان جیسا کوئی اور فہم وفراست والا سیاست دان آزاد کشمیر میں پیدا ہوسکے۔ ان کی نماز جنازہ اسلام آباد اور غازی آباد میں ہزاروں لوگوں نے پڑھ کر ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مرکزی حکومت اور پاکستان کے قومی میڈیا نے ان کی موت کو معمول کے واقعہ کے طور پر لیا، حالاں کہ ان کا پاکستان کے لیے غیر معمولی کردار رہا ہے۔ اگر ان جیسا آدمی قومی دھارے میں ہوتا تو قومی جھنڈا بھی سرنگوں رہتا اور قومی سوگ بھی منایا جاتا۔ تاہم فوج نے ان کو فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

## سردار محمد ابراہیم خان مرحوم

سردار محمد ابراہیم خان مرحوم تحریک آزادی کشمیر کے بلا شک وشبہ نمایاں کردار تھے، جن کے سرینگر کے گھر پر انتہائی جان لیوا حالات میں آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس نے پاکستان کے ساتھ





الحاق کی قرارداد پاس کی تھی۔ ان کو یہ کریڈٹ حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے 230 بال بچے چھوڑ کر سرینگر سے پاکستان ہجرت کی اور ان حالات میں یہاں آزاد حکومت کی صدارت سنبھالی، جب اس علاقے کے مستقبل کی صورتِ حال مخدوش تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے الحاق کشمیر کو مشکوک بنانے میں سب سے بڑا کردار سردار ابراہیم خان مرحوم کا ہے جنہوں نے ایک منتخب نمائندے کی حیثیت سے آزاد علاقوں پر مشتمل حکومت کی بنیاد ڈالی، اور پھر اس کے نمائندے کے حیثیت سے سلامتی کونسل میں گئے۔ آزاد کشمیر کی حکومت کے قیام کے وقت مرحوم جموں وکشمیر اسمبلی کے منتخب ممبر تھے اور اپنی نمائندہ حیثیت کو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر مرتے دم تک قائم رکھا۔ آزاد کشمیر بلکہ پاکستان کے ایک بڑے ''سدھن'' قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مرحوم بیرسٹر تھے جس تربیت کی وجہ سے ان کی زندگی ڈسپلن کا ماڈل تھی جس پر انہوں نے زندگی بھر سمجھوتہ نہیں کیا۔ وقت اور وعدے کے پابند، لباس اور گفتگو میں نفیس، تعلقات اور معاملات میں اعتدال کے حامل تھے۔ تمام تر خوبیوں کے باوجود ان کے قبیلے نے ان کو آزاد کشمیر یا پاکستان کا نہیں بلکہ اپنے قبیلے کا لیڈر ٹریٹ کیا جس وجہ سے سردار عبدالقیوم سیاسی اثر ورسوخ میں ان پر سبقت لے گئے، وگرنہ ان کی خوبیوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے پہلی بار ان سے ملاقات کا موقع اگست 1976 میں پونچھ ہاؤس راولپنڈی میں ملا جب وہ صدر تھے۔ میری ان سے ملاقات امین مختار مرحوم نے کروائی جو وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے راولپنڈی میں آباد مہاجر تھے اور ان دنوں صدر کے مشیر تھے۔ امین مختار صاف ستھرے، اجلے لباس میں ملبوس خود پسند شخص تھے۔ ان کے ساتھ میرا تعارف میرے چھوٹے بھائی نظیر گیلانی نے کرایا تھا۔ امین مختار صاحب نے سردار صاحب کے پاس مجھے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جس پر انہوں نے کہا، میرے لیے ان کا تعارف اتنا ہی کافی ہے کہ یہ اس وطن سے آئے ہیں جس نے مجھے لیڈر بننے کا موقع دیا۔ میں آبی گذر کے دن کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ آبی گذر سرینگر میں ایک محلہ ہے جہاں سردار صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کی سادہ اور باوقار طبیعت مجھے بہت پسند آئی اور اس کے بعد ان سے تا دم مرگ میرے تعلقات رہے۔

2002 میں جب میں ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر ہوا، سردار صاحب صدر تھے، حلف دینے کے بعد میرا ماتھا چوما اور کہا کہ اللہ نے مجھے یہ سعادت دی کہ میں نے آپ کو حلف دیا۔ میں نے برجستہ کہا، سعادت دینا یقیناً اللہ کا کام ہے اور آپ کا مجھے حلف دینا میرے لیے بھی باعث سعادت ہے۔ ان کے بیٹے سردار خالد ابراہیم خان جو کہ آزاد کشمیر کے اپنے ہم عمر لیڈروں میں سب سے زیادہ بااصول ہیں۔ سردار صاحب کی مدت صدارت کے دوران اسمبلی کے ممبر بھی تھے اور ہمہ وقت سرگرم بھی رہتے تھے لیکن ان کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ تاہم صدر ہاؤس اور باقی لوگوں کے ساتھ اہم معاملات میں رابطے میں رہتے تھے۔ سردار صاحب نے خالد صاحب کے ذریعے مجھے چیف احتساب کمشنر بننے کی پیشکش کی جو میری جج کی ذمہ داریوں کے علاوہ ہوتی۔ میں نے ان کو کہا کہ اگر آپ لوگ بامعنی احتساب کروانا چاہتے ہیں اس قانون میں احتساب کمیشن کو از خود کارروائی کرنے کا اختیار بھی دیں لیکن انہوں نے صدر صاحب کے مشورہ کے بعد کہا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے یہ اختیار حکومت اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ اس پر میں نے ان کی پیشکش پر معذرت کر لی۔

آزاد کشمیر یونیورسٹی کے انتظامی معاملات بہت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے سردار صاحب نے مجھے وائس چانسلر مقرر کرنے کی پیشکش کی جس کو میں نے قبول کر لیا کیوں کہ تعلیمی معاملات سے مجھے بہت دلچسپی رہی ہے۔ یونیورسٹی کا اپنا کوئی کیمپس نہیں تھا، اس کو میں نے Consolidate کیا اور ایک باضابطہ یونیورسٹی کی شکل دی۔ اس پر سردار صاحب ہمیشہ ہر جگہ میری تعریف اور انتظامیہ کو میری تقلید کرنے کو کہتے رہتے۔ مجھے یونیورسٹی گراونڈ میں چند جہادی تنظیموں کے جلسہ کی اجازت پر مجبور کیا گیا، لیکن میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور استعفیٰ دے دیا۔ اس پر سردار صاحب کو بہت افسوس ہوا (یہ واقعہ پہلے بھی گزر چکا ہے) کہ ان کی صدارت کے دوران ایسا واقعہ ہوا ہے کہ مجھے استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کو اس بات کا ہمیشہ رنج رہا اور اس بات کا ہر ملاقات پر ذکر کرتے رہے۔

اس عرصہ کے دوران شریعت کورٹ میں ججوں کی تقرری اور شریعت کورٹ کی تشکیل کو عدالت میں چیلنج کیا گیا تھا۔ سردار صاحب کو شریعت کورٹ کے جج سردار نواز خان سے دلچسپی تھی





کیوں کہ یہ ان کی برادری، حلقے اور جماعت کے ساتھ بھی تعلق رکھتے تھے[230]۔ انہوں نے مجھے ایک روز اشارتاً اس کا ذکر کیا جس کو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شریعت کے معاملات شرعی اصولوں کے مطابق نمٹائے جائیں گے تاکہ شریعت کی بالادستی قائم ہو۔ اس مقدمہ کا فیصلہ میں نے ان کی خواہش کے خلاف کیا، لیکن انہوں نے اس کا کبھی بُرا نہ منایا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب میں چیف جسٹس ہائی کورٹ تھا تو سردار نواز خان صاحب کو ہائی کورٹ کے جج کے لیے تجویز کیا۔ جب جموں وکشمیر کونسل نے اس معاملے میں تاخیر کی تو میں نے ایک عدالتی حکم کے ذریعے کونسل کو لکھا کہ اگر تجویز کردہ پینل میں سے دو ہفتے کے اندر تقرری نہیں کی جاتی تو جس قانون کے تحت احتساب کی عدالت قائم کی گئی ہے، اس کو معطل سمجھا جائے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک ہفتے کے اندر ہی تقرری ہوگئی۔ ایک روز اس کے بعد سردار صاحب سے میری ملاقات ہوئی جس پر انہوں نے مجھے گلے لگایا اور مبارک باد دی کہ آپ نے بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارا ہے شکر ہے محفوظ رہ گئے، آئندہ احتیاط کرنا۔ یہ منسٹری والے بڑے۔۔۔

وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی برادری سے تعلق رکھنے والے ایک پروفیسر خضر حیات کو جو زوآلوجی کے سربراہ لیکن اضافی چارج کنٹرولر امتحانات کا بھی رکھتے تھے، کو میں نے اپنے شعبہ میں بھیج دیا اور دوسرے پروفیسر کو کنٹرولر مقرر کیا۔ اس پر سردار صاحب نے حکم واپس لینے کا بہت اصرار کیا لیکن میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے فارغ کر سکتے ہیں، میں حکم واپس نہیں لوں گا۔ سردار صاحب نے کہا کہ آپ کی یونیورسٹی کو ضرورت ہے، خضر اور بھی مل جائیں گے۔

میں بحیثیت ایڈووکیٹ جنرل یا جج جب بھی راولاکوٹ یا اسلام آباد جاتا، جہاں سردار صاحب رہا کرتے تھے، ضرور ان کے پاس جایا کرتا۔ ان کو ہر وقت مطالعہ یا بیڈمنٹن میں مصروف پاتا۔ راولاکوٹ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر ان کا گھر تھا جس کے ساتھ ہی ملٹری ایوی ایشن کا ایک بہت بڑا ریڈار لگا ہے۔ سردار صاحب اس ریڈار پر موجود فوجیوں کے ساتھ بیڈمنٹن یا گپ شپ کیا کرتے تھے۔ چھوٹا سا مکان تھا اور اس کے عقب میں ہی اپنی اور اپنی بیگم کی قبر تیار کر رکھی تھی جس کے اوپر باضابطہ طور پر چھت ڈالی ہوئی تھی۔ وہ ہر روز اس قبر کی زیارت کرتے اور اس کی صفائی کیا کرتے تھے۔ نیک شخص کی یہ پہچان

ہے کہ وہ اپنی آخرت کو یاد رکھتا ہے۔ یہ نیک شخص میں نے سردار ابراہیم کی صورت میں دیکھا۔

میں ایک روز اسلام آباد میں ان کے گھر گیا جو مارگلہ روڈ پر واقع تھا۔ اس کے ساتھ بہت بڑا ایریا تھا۔ حالاں کہ ان کے نام صرف دو کنال رقبہ الاٹ تھا۔ میں نے ان سے پوچھا، سردار صاحب اسلام آباد میں اس سڑک پر اتنا رقبہ آپ کو کیسے ملا؟ سردار صاحب نے کہا، اصل میں یہ دو کنال ہے لیکن اس کے بائیں طرف جو نالہ ہے اس پر میں نے ''نوتوڑ'' کی ہے یعنی اس کو آباد کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پونچھیوں کی عادت ہے کہ وہ بنجر رقبہ کی نوتوڑ کرتے ہیں۔ میں نے یہی کر کے رقبہ پر درخت لگائے ہیں لیکن یہ رقبہ میرا نہیں ہے۔ یہ CDA کا ہی رہے گا۔ اوپن ایریا رہے گا لیکن اس کو استعمال کرنے کا حق اس مکان والے کو ہی حاصل رہے گا۔

کشمیر پر ان کا ذاتی موقف تھا کہ اس نے بالآخر ایک آزاد اور خود مختار ملک بننا ہے، یہ کب بنے گا کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا آزاد کشمیر کا پاکستان کے ساتھ رہنا ناگزیر ہے۔ میرے پاکستان میں ہوتے ہوئے سردار ابراہیم خان صاحب جون 1975 سے اکتوبر 1978 تک آزاد کشمیر کے صدر رہے، جب ان کو اکتوبر 1978 میں جنرل ضیاالحق نے برطرف کر کے جنرل عبدالرحمان کو صدر مقرر کیا۔ دوسری بار اگست 1996 سے 2001 تک آزاد کشمیر کے صدر رہے۔ سوائے سردار خالد ابراہیم کے جو متحرک سیاسی کارکن ہیں، میں نے سردار صاحب کے کسی دوسرے بیٹے کو صدر ہاؤس میں بھی نہیں دیکھا۔

سردار صاحب نے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد 31 جولائی 2003 کو اسلام آباد میں وفات پائی جبکہ ان کو اپنے آبائی گاؤں میں اسی قبر میں دفن کیا گیا جو انہوں نے اپنی زندگی میں تیار کی تھی۔ یہ اعزاز کسی کسی کے ہی نصیب میں ہوتا ہے۔ اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ آمین۔

؎ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

## خورشید حسن خورشید

خورشید حسن خورشید، جن کے نام کا مخفف کے ایچ خورشید ہے، قائداعظم محمد علی جناح کے







پرائیویٹ سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے وطن مولود مقبوضہ کشمیر کی بجائے لاہور پاکستان میں آباد ہو گئے اور ازاں بعد آزاد کشمیر کی سیاست میں شامل ہوئے۔ قائداعظم کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے خورشید صاحب کا بڑا نام اور توقیر تھی جس وجہ سے کشمیر کے صف اوّل کے لیڈروں میں شامل تھے۔ اسی وجہ سے ان کو 1959 سے 1964 تک آزاد کشمیر کا صدر رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ پیشہ کے لحاظ سے بیرسٹر تھے، اس لیے لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ پاکستان میں ایوب خان مرحوم کی بنیادی جمہوریت کے قانون کو آزاد کشمیر میں توسیع دے کر یہاں بھی یہی سسٹم رائج کروا دیا اور پاکستان میں آباد ریاست کے باشندوں کو آزاد کشمیر کی سیاست میں بطور حصہ دار شامل کر دیا۔ آزاد کشمیر کے لوگوں کو پاکستان کی طرز پر ووٹ کا حق تو مل گیا لیکن مہاجرین مقیم پاکستان کے ذریعے ان کا حق حکمرانی محبوس کر دیا۔ ممکن ہے مقصد نیک ہوتا لیکن آزاد کشمیر کا اندرونی آئینی اور قانونی ارتقا، غیر آباد ریاستی باشندوں کے ہاتھوں یرغمال بن گیا۔ اگر پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کا قانون نہ بنا ہوتا تو آزاد کشمیر میں بھی ایسا ہونا ممکن نہیں تھا کیوں کہ پاکستان کے مغائر یہاں کوئی نظام چلنا یا چلانا ممکن نہیں۔ خورشید صاحب نے زرعی اصلاحات کر کے آزاد کشمیر میں عمدہ روایت قائم کی جس سے بے شمار بے زمینوں کو زمین ملی۔

مرحوم خورشید صاحب نے آزاد کشمیر کو ریاست جموں و کشمیر کی نمائندہ حکومت کے طور پر تسلیم کرنے کا نظریہ پیش کیا جس کی کافی پذیرائی ہوئی اور ہے کیوں کہ یہ ایک دلچسپ نظریہ ہے جس کے تحت آزاد کشمیر ایک خود مختار ملک کے طور پر دنیا میں نمودار ہوتا۔ 24 اکتوبر 1947 کا ڈیکلریشن بھی یہی تھا۔ اس نظریے کے اچھے یا برے ہونے کے بارے میں بحث کی جا سکتی ہے لیکن یہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کی نفی تھی۔ ان کے تحت مہاراجہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کو نظر انداز بلکہ رد کرتے ہوئے ریاست کو متنازع اور حل طلب قرار دے کر اس کا فیصلہ استصوابِ رائے کے ذریعہ کروانے کا اصول طے ہوا۔ خورشید صاحب مرحوم نے پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت بننے، اپنی جماعت کو اس میں ضم کر کے خود ہی اپنے نظریے کی نفی کر دی اور بھٹو صاحب کے اقتدار سے برطرفی کے بعد پھر اس

جماعت کا احیا کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک سوالیہ علامت بن گیا۔ مرحوم 1975 اور 1985 کی آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبر ہونے کے علاوہ 1985 میں اسمبلی کے اندر قائد حزبِ اختلاف بھی رہے۔

مرحوم امانت اور دیانت کے لحاظ سے یکتا تھے، بد دیانتی سے ان کا دامن تادم مرگ صاف رہا۔ میرا مسلم کانفرنس میں شامل ہونے تک ان کے ساتھ دعا سلام کا تعلق رہا۔ اور اس وقت تک بہت پیار اور احترام سے پیش آتے رہے لیکن اس کے بعد مرحوم نے بے رخی برتی۔ ان کی وفات راولپنڈی سے عام ویگن میں لاہور جاتے ہوئے 11 مارچ 1988 کو حادثہ میں ہوئی اور تدفین مظفر آباد میں۔ اللہ مغفرت کرے۔ آج کشمیری قوم اس مخلص اور دیانت دار لیڈر کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے۔

## جنرل محمد حیات خان مرحوم

پاکستان میں 1977 میں جنرل محمد ضیا الحق مرحوم کے مارشل لاء کے ساتھ ہی آزاد کشمیر میں بھی حکومت کی بساط لپیٹی گئی۔ آزاد کشمیر میں یہ ایک عجیب طرح کا مارشل لاء تھا جو کہ آزاد کشمیر اسمبلی اور کونسل کے مشترکہ اجلاس میں 1974 کے آئین میں دفعہ A-53 کے اضافہ کے ذریعے لگایا گیا۔ اس دفعہ کے تحت حکومت پاکستان کو اختیار دیا گیا کہ آزاد کشمیر اسمبلی، کونسل، صدر اور وزیر اعظم برطرف کر کے منتظم اعلیٰ کی تقرری کر سکے، جو کہ یہاں کا نظم و نسق چلائے۔ یہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والی بات تھی کہ یہاں کا نظام یہاں کے نمائندوں نے خود تشکیل دیا ہے جو عملی طور مارشل لاء تھا۔ اس دفعہ کے تحت پہلے جنرل عبدالرحمان مرحوم کو آزاد کشمیر کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا گیا جو اپنے کام سے کام رکھنے والے شریف النفس آدمی تھے۔ انہوں نے نہ چھیڑو اور چھیڑے جاؤ والی پالیسی اپنائی رکھی۔ لیکن جب پاکستان میں سیاست دانوں کو انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے احتساب کا عمل شروع کر کے پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو آزاد کشمیر میں بھی یہی عمل شروع کیا گیا، جس کام کے لیے پاکستانی فوج کے کشمیری نژاد بریگیڈیئر محمد حیات خان کا انتخاب کیا گیا۔ وہ اکتوبر 1978 میں آزاد کشمیر کے منتظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور 1983 تک وہ اسی حیثیت میں صدر، وزیر اعظم اور سپیکر کے اختیارات استعمال کرتے رہے۔ اس فوجی جوان نے







آزاد کشمیر کے لیڈروں کی چیخیں نکال دیں۔ انہوں نے احتساب کے نام پر صف اوّل کے سب سیاست دانوں کو ایسا کس کے رکھا کہ جیل کی ہوا کھائے بغیر کوئی نہیں بچ سکا۔ یہ احتساب کم اور انتقام زیادہ تھا۔ اس مارشل لاء کے دور میں آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد یوسف صراف مرحوم نے لوگوں کو بھرپور ریلیف دیا جس کی سزا ان کو ریفرنس، برطرفی اور سزا کے طور پر بھگتنی پڑی۔ اس کڑے وقت میں ان کی مدد کے لیے کوئی سامنے نہیں آیا۔ حتیٰ کہ جن سیاست دانوں کو انہوں نے بھرپور ریلیف دیا تھا انہوں نے بھی ان شعلوں کو ہوا دی۔ ان کے تنہا ہونے کی ایک وجہ ان کے کشمیری مہاجر ہونے کے علاوہ ان کا بھٹو کا طرف دار ہونا بھی تھا۔

بریگیڈیئر حیات خان مرحوم کو آزاد کشمیر کی صدارت سے رخصت ہونے کے بعد میجر جنرل کے اعزازی عہدے پر ترقیاب کیا گیا، قطع نظر ان کے انتقامی اقدامات کے دراصل جو جنرل ضیا الحق کی پالیسی کا حصہ تھے، وہ ذاتی طور پر بے حد محنتی، دیانت دار، کفایت شعار اور شریف النفس انسان تھے۔ آزاد کشمیر کی تعمیر و ترقی کا اگر ان کو بانی یا مائی باپ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے سڑکوں، پانی کی فراہمی، بجلی کی ترسیل، سکولوں اور کالجوں کے جال بچھائے۔ میرٹ، شفاف اور دیانت دار انتظامیہ کے فراہم کرنے کا ایسا قابل رشک نظام رائج کیا کہ ان کے بعد مجھے کسی دور میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ اپنے بعد آنے والے سیاست دانوں اور حکمرانوں کے لیے انہوں نے ایک سخت معیار قائم کر دیا جس پر آج تک کوئی پورا نہیں اترا۔ اللہ کرے کوئی ان کا ریکارڈ توڑے۔ مرحوم نے ایک چھوٹی نوٹ بک رکھی تھی جس میں ہر منصوبے کی تعمیر اور اس کی تکمیل کی تاریخ لکھ رکھتے تھے، ساتھ ہی اس کے افتتاح کی تاریخ بھی دے دیتے اور اس کے مطابق سب کچھ تیار ہو جاتا۔ جو اس ہدایت پر عمل نہ کرتا، وہ نوکری سے فارغ ہو جاتا۔

جنرل حیات خان مرحوم کے ساتھ میرا تعلق بحیثیت وکیل اور بلدیاتی کونسلر کے رہا۔ بریگیڈیئر اسلم خان مرحوم جو آزاد کشمیر میں ایک فاریسٹ لیسی کے طور کام کرتے تھے، کے ایک مقدمے میں مجھے راجہ نیاز خان مرحوم سیکریٹری نے وکیل مقرر کر کے جنرل صاحب سے ملاقات کرائی۔ جب

سیکریٹریز اور جنگلات کے اعلیٰ احکام کی میٹنگ میں میں نے اس مقدمہ کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا تو جنرل صاحب بہت خوش ہوئے اور سیکریٹری قانون کو ہدایت کی کہ آئندہ کے لیے حکومت کے سارے مقدمات منظور گیلانی صاحب کو دیا کریں۔ میں نے وہیں ان سے کہا کہ جناب سیاست دانوں کے خلاف مقدمات کے علاوہ! انہوں نے پوچھا، وہ کیوں؟ میں نے کہا کہ سیاست دان اس ملک کا انسانی سرمایہ ہیں۔ میں ان کے خلاف کسی مہم میں حصہ دار نہیں بن سکتا اور اگر کبھی آپ نے سیاست میں آنے کا سوچا تو آپ کے خلاف بھی کسی مہم کا حصہ نہیں بنوں گا۔ اس پر انہوں نے قہقہہ لگایا اور بہت محظوظ ہوئے۔

ان کے عرصہ صدارت کے دوران آزاد کشمیر میں پاکستان کی طرز پر زکوٰۃ اور بلدیاتی نظام بھی رائج کیا گیا۔ میں نے 1980 کے زکوٰۃ کونسل کے الیکشنز میں حصہ لیا اور مظفر آباد میں چیئرمین منتخب ہوا اور اس کے بعد میونسپل کمیٹی مظفر آباد 1983 کے الیکشن میں کونسلر منتخب ہوا۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ اکثر نہ صرف رابطہ رہتا بلکہ تبادلہ خیالات کا موقع بھی ملتا رہتا تھا۔ زکوٰۃ کے حوالے سے انہوں نے میرے پروگرام کو آزاد کشمیر بھر میں رائج کیا کہ زکوٰۃ کی رقم کو تقسیم کرنے کی بجائے اس رقم سے لوگوں کو سیلف ایمپلائمنٹ فراہم کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح ایک دو ہزار روپے فی کس بے شمار مستحق لوگوں کو دینے کی بجائے چند مستحق لوگوں کو سلائی مشین، دکان یا کوئی اور کاروبار کرنے کے لیے زیادہ رقم دے کر ایک فیملی کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع دیا جائے۔ انہوں نے ایسا نظام قائم کیا کہ نقدی رقم صرف سکول کے مستحق بچوں کی فیس، وردی، کتابوں اور ہسپتال میں بیماروں کے علاج پر خرچ کی جائے۔ ان کے عہدہ صدارت کے دوران ایسا ہی ہوتا رہا لیکن اس کے بعد زکوٰۃ سیاست اور سیاست دانوں کی نذر ہوگئی۔

بلدیاتی نظام میں انہوں نے رابطہ سڑکوں اور واٹر سپلائی پر بھرپور توجہ دی۔ حکومتی سطح پر بجلی، سکول، کالجز وغیرہ کے قیام کے علاوہ دیہات میں سڑکوں اور پانی کی سپلائی کا جال بچھا دیا۔ ان کا ماٹو تھا کہ کسی عورت کے سر پر پانی کا گھڑا نہ ہو۔ مرحوم کا ہر شخص کے ساتھ رابطہ رہا۔ وہ پہلے حکمران ہیں جنہوں نے گھر گھر اور گاؤں گاؤں رابطہ کیا جس وجہ سے ان کے بعد آنے والے سیاست دان ایسا کرنے پر







مجبور ہو گئے۔ دیگر سیاست دانوں نے لوگوں کو اپنا غلام سمجھا تھا اور اپنے گھروں یا بڑے قصبوں میں لوگوں کے ساتھ ملاقات کو لوگوں پر احسان عظیم گردانتے تھے۔

مرحوم جب عہدۂ صدارت سے الگ اور فوج کی نوکری سے ریٹائر ہوئے تو اپنے زمانے کے بلدیاتی نمائندوں کا ہر ضلع میں کنونشن بلا کر ان سے اپنی سیاسی جماعت بنانے کے بارے میں رائے لی اور ان کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ نظام چوں کہ ان کا شروع کردہ ہے اس لیے یہ سارے لوگ ان کے ساتھ شامل ہوں گے۔ ان کی کارکردگی بلا شبہ ایسی تھی کہ ان کی حمایت کی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا کیوں کہ فوج کی حکمرانی کا دور ختم ہو رہا تھا۔ لوگوں کو اس سسٹم سے نفرت ہو رہی تھی اور دنیا بھر میں جمہوری دور نے انگڑائی لی تھی جس کے اثرات آزاد کشمیر سمیت ہر جگہ مرتب ہو رہے تھے۔

مظفر آباد میں مرحوم حبیب الرحمان اعوان جو ان کے زمانے میں چیئرمین میونسپل کمیٹی مظفر آباد ضلع رہے تھے، کے گھر پر اس قسم کا کنونشن طلب کیا اور لوگوں سے رائے طلب کرنے کے علاوہ اس جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ نئی جماعت بنانے کی بجائے وہ آزاد کشمیر کی کسی جماعت کی حمایت کریں اور چوں کہ میرا تعلق مسلم کانفرنس سے تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس جماعت میں آ جائیں، میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ جنرل صاحب نے جواب دیا کہ آپ میری محنت کو ''ٹھگوں'' کی جماعت میں شامل کروا کر ضائع کرانا چاہتے ہیں۔ مجھے اس وقت ان کی یہ بات ناگوار گزری اور صرف یہ کہہ کر میٹنگ سے واک آؤٹ کیا کہ اس جماعت کو قائداعظم کی تائید اور سردار ابراہیم خان جیسے شخص کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ ان کو مجھے اس صف میں شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

1985 کے اسمبلی کے الیکشن میں جنرل صاحب کی نوزائیدہ پارٹی تحریک عمل نے غالباً 9 سیٹیں حاصل کر کے آزاد کشمیر میں دوسری بڑی پالیمانی جماعت ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اگر ان کی تعمیر و ترقی کے پروگرام کو جاری رکھنے والا کوئی پیدا ہوا ہوتا تو آزاد کشمیر اس وقت تک مشرق کا سوئٹزر

لینڈ بن گیا ہوتا۔مرحوم نے تین بار اسمبلی میں اپنے حلقے کی نمائندگی کی۔ جنرل صاحب سے میری ملاقات ایک دن راولپنڈی میں ان کی علالت کے دوران ہوئی۔ میں نے پوچھا جنرل صاحب مسئلہ کیا ہے، آپ تو بہت متحرک ہوا کرتے تھے، اب معذور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مذاقاً کہا ریموٹ کنٹرول نے معذور کر دیا۔ اس سے پہلے ٹی وی، بجلی کرسی یا چارپائی سے اٹھ کر بند کرتا تھا تھوڑی بہت حرکت ہو جاتی تھی اب یہ کام بھی لیٹے لیٹے ہوتا ہے، جس وجہ سے معذور ہو گیا۔ مرحوم کی وفات راولپنڈی میں 19 مئی 2010 کو ہوئی جبکہ تدفین اپنے گاؤں چھوٹا گلہ، راولاکوٹ میں ہوئی۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

## سردار سکندر حیات خان

سردار سکندر حیات خان کو دو بار آزاد کشمیر کا صدر اور دو بار وزیر اعظم رہنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1970 کی دہائی کے بعد آزاد کشمیر کے سیاست دانوں میں سب سے زیادہ زیرک، قادر الکلام، ٹیبل ٹاک کے ماہر اچھے منتظم ہیں۔ اپنی ذہانت اور لوگوں کو ساتھ چلانے کی صلاحیت کے باعث اپنے اور پرائے ان کی عزت کرتے رہے ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے وکیل ہیں لیکن وکالت کبھی نہیں کی۔ البتہ موشگافیوں میں وکیل سے زیادہ ماہر ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ ایک سیاسی کارکن، ایڈووکیٹ جنرل، چیف جسٹس ہائی کورٹ اور چیف الیکشن کمشنر کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ 1985 کی حکومت بنانے کے بعد 1986 میں مجھے تمام تر مخالفت کے باوجود ایڈووکیٹ جنرل مقرر کیا اور چیف سیکریٹری کو ہدایت کر رکھی تھی کہ کیبنٹ کی ہر میٹنگ میں مجھے بلایا جائے۔ اسمبلی کے اندر میری سیٹ وزیر قانون کے ساتھ رکھوائی تھی۔ سرکاری مقدمات میں ہدایت دے رکھی تھی کہ میری خواہش کے بغیر کسی کو وکیل مقرر نہ کیا جائے۔ ان کی حکومت کے دوران ہر محکمے کو اپنی حدود کے اندر رہ کر مکمل اٹانومی حاصل تھی۔

سردار عبدالقیوم صاحب اس زمانے میں صدر ہوا کرتے تھے لیکن حکومتی معاملات میں ان کی مداخلت کو نہ کبھی روا رکھا اور نہ اس کی اجازت تھی انہوں نے اس عرصہ کے دوران سردار صاحب کو بالکل بے بس اور صدارت کی حد تک محدود کر رکھا تھا۔ ان کا مختصر قانونی موقف تھا کہ صدر اپنی مرضی اور





اختیار سے صرف کھا پی اور سو سکتے ہیں اور ایک اچھے بچے کی طرح وزیر اعظم کے مشورے کے پابند ہیں۔ مشورہ کو وہ ہدایت کہتے تھے۔ ان کے پہلے دورِ وزارتِ عظمیٰ کے دوران کسی کی مجال نہیں تھی کہ کرپشن یا بدانتظامی کرے۔ انہوں نے اپنے ایک معتمد ترین سیکریٹری راجہ نیاز احمد خان مرحوم کو نوکری سے برطرف کر کے بیوروکریسی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جب وہ وزیر اعظم بنے، پاکستان میں جنرل ضیاالحق کی حکومت تھی اور بعد میں محمد خان جونیجو وزیر اعظم بنے۔ سکندر صاحب کو ان کا بھرپور اعتماد حاصل تھا، اس لیے ان کی بیوروکریسی پر گرفت بہت مضبوط تھی۔ میرٹ کا بھرپور خیال رکھتے تھے۔

جنرل ضیاالحق اور محمد خان جونیجو مرحوم نے انہیں راجہ محمد عباس خان جو آج کل سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں، کے بارے میں نہ صرف سفارش بلکہ اصرار بھی کیا کہ انہیں اسسٹنٹ کمشنر لگایا جائے۔ عباس خان ان دنوں بحیثیت وکیل میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ سکندر صاحب نے مجھے کہا کہ عباس خان سے کہو کہ ان انتظامی عہدوں پر تقرری سوائے پبلک سروس کمیشن کے امتحان پاس کرنے کے نہیں ہو سکتی، اگرچہ میری نوکری اور وزارت عظمیٰ ہی کیوں نہ چلی جائے۔ تاہم ایڈہاک بنیادوں پر سیکشن آفیسر یا سول جج لگایا جا سکتا ہے جس کے لیے بھی پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنا ضروری ہو گا۔

انہوں نے سردار عبدالقیوم صاحب کے برعکس اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں کے دوران اپنے بیٹوں یا بھائیوں کو حکومتی معاملات میں مداخلت کی نہ اجازت دی اور نہ ہی کوئی عہدہ دیا جس وجہ سے بدانتظامی سے پاک رہے۔ تاہم حکومت کے دو سال کے بعد ان کے خلاف کرپشن کے الزام لگنے شروع ہو گئے جس کی وجہ سے ان کی اخلاقی پوزیشن اور گرفت کمزور ہو گئی۔ اقتدار کے تیسرے سال سے کنبہ اور قبیلہ پروری بھی ظاہر ہونے لگی۔ موصوف برملا کہا کرتے تھے کہ راج پوتوں (جس سے وہ تعلق رکھتے تھے) کے بغیر آزاد کشمیر نہیں چل سکتا۔ انہوں نے اپنے بھائی اور بیٹے کو سیاست میں لا کر اسمبلی اور آزاد کشمیر کونسل کا ممبر بنایا اور ابتدائی دور میں راجہ آزاد خان مرحوم ایک وکیل اور اپنے دوست

کو کسٹوڈین جائیداد متروکہ بنا کر جج ہائی کورٹ کے برابر مراعات مقرر کیں۔ اس کے بعد اپنے داماد چوہدری محمد رشید کی چیئرمین سروس ٹریبونل بنا کر جج ہائی کورٹ کے برابر مراعات اور فلیگ کا استحقاق بھی دیا۔ اس طرح یہ بدعت عام ہوگئی۔ اب ہر کس و ناکس کو جج ہائی کورٹ کی مراعات کا سلسلہ آزاد کشمیر میں عام ہو گیا، اس سے ان عہدوں کے وقار میں اضافہ نہیں ہوا لیکن جج ہائی کورٹ کا وقار گر گیا۔ راجہ فاروق حیدر خان اس کا تدارک کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔

1985 کی حکومت بنانے کے ساتھ ہی انہوں نے آئین میں دو غیر جمہوری ترامیم کروائیں جن کے ذریعے بالواسطہ الیکشن سے اسمبلی میں عورتوں کی پانچ، ٹیکنو کریٹ، علمائے دین اور سمندر پار کشمیریوں کی ایک ایک نشست کا اضافہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی صورت میں ایسے ممبران اسمبلی کے ووٹ کو نہیں گنا جا سکتا جنہوں نے ابتدائی طور پر وزیر اعظم کے چناؤ کے حق میں ووٹ دیا ہو یا حکومتی پارٹی کے ٹکٹ پر جیتنے یا الیکشن جیتنے کے بعد اس میں شامل ہوئے ہوں۔ آخر الذکر ترمیم کے خلاف آزاد کشمیر کی حزب اختلاف کی ساری جماعتوں نے ایسی تحریک چلائی کہ سکندر صاحب کی حکومت گرتے گرتے بچی اور ان کو مجبوراً یہ ترمیم واپس کرنا پڑی۔ بالواسطہ ممبران اسمبلی کے انتخاب اور غیر مقیم ریاستی باشندوں یعنی مہاجرین مقیم پاکستان کی نشستوں کی وجہ سے آزاد کشمیر کے جمہور کے حق ووٹ پر ڈاکہ ہے، جو ایڈلٹ فرنچائز کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس طرح آزاد کشمیر کی 49 کی اسمبلی میں 20 پر عوامی نمائندے نہیں بلکہ حکومتی نمائندے قابض ہیں جس سے اسمبلی کی نمائندہ پوزیشن مشکوک ہوگئی ہے۔

اس عرصہ کے دوران ہی سکندر صاحب نے جموں و کشمیر لبریشن سیل کا قیام عمل میں لایا جس کا ابتدائی مقصد تو کشمیر پر ریسرچ اور تشہیر کا کام کرنا تھا لیکن اب یہ کرپشن کا اڈہ بن گیا۔ کشمیر میں 1989 کی مسلح جہد و جہد کے نتیجے میں جب کشمیری حریت پسندوں/مجاہدین نے آزاد کشمیر آنا شروع کیا تو ان کی دیکھ بھال کے لیے کشمیر لبریشن سیل نے رابطہ کا بہترین کام کیا اور ان لوگوں کو سہولت دی۔ اس کا مکمل اختیار سردار عبدالقیوم صاحب کو دے کر ان کو اس میں مصروف کرایا گیا۔ لبریشن سیل کو ملک عبدالرشید



مرحوم نے انتہائی محنت سے ایک ادارے کی شکل دی۔ بھرپور محنت کی اور اس کے سائے میں لٹریچر، سیمینار اور مذاکرے کروائے۔ اب یہ بدنامی کا اڈہ بن گیا ہے۔

سردار سکندر حیات 1985 سے 1990 تک وزیر اعظم، 1991 سے 1996 تک صدر اور پھر 2001 سے 2006 تک دوبارہ وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ 1996 میں مدتِ صدارت ختم ہونے سے پہلے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر اسی اسمبلی کی مدت ختم ہونے سے پہلے دوبارہ اپنے آپ کو صدر منتخب کرایا لیکن 1996 کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کی اکثریتی اسمبلی نے ان کو اگست 1996 میں ہی دو تہائی اکثریت سے عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعہ برطرف کر دیا۔ یہ سکندر صاحب اور ان کی پارٹی کی بچگانہ حرکت تھی، جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھی۔

## سردار سکندر اور الیکشن 1990

1990 کے اسمبلی الیکشن میں سکندر صاحب نے دو نشستوں پر الیکشن جیتا لیکن جموں نمبر 6 کی نشست سے ان کا الیکشن کالعدم قرار دیا گیا۔ میں نے بحیثیت ایڈووکیٹ جنرل ان کے اس الیکشن پر اعتراض کیا تھا جس کی وجہ سے ہمارے تعلقات خراب ہو گئے اور میں نے استعفیٰ دے دیا۔ سکندر صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ 1990 کے الیکشن کے بعد بننے والی نئی حکومت کے وزیر اعظم راجہ ممتاز حسین راٹھور کو مبارک باد دی۔ ہار پہنائے اور سرکاری سطح پر اقتدار ان کے حوالے کیا۔ آزاد کشمیر میں اعلیٰ روایات کا یہ کلائمیکس تھا۔ چوں کہ اپنے عرصہ حکومت کے دوران سکندر صاحب نے سردار عبدالقیوم صاحب اور ان کے بیٹوں کو حکومت کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیا۔ اس کے انتقام میں انہوں نے سکندر صاحب کو حکومت سے الگ کرنے اور راٹھور کی حکومت کے قیام میں بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔

سکندر صاحب نے صدر بن کر وہی کچھ کیا جن کو بحیثیت وزیر اعظم، صدارتی مداخلت سمجھتے تھے۔ سردار عتیق احمد خان جو اس وقت عملاً وزیر اعظم تھے، نے ان کو ویسا ہی ٹف ٹائم دیا جو انہوں نے سردار عبدالقیوم صاحب کو دیا تھا۔ اس نے سکندر صاحب کو بالکل تنہا کر کے رکھ دیا تھا اور وہ بے بس

ہو گئے تھے۔سکندر صاحب نے عرصہ صدارت کے دوران عتیق خان اور سردار سیاب خالد کے اکسانے پر میرے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر کروا کر حکومت کے خلاف ایک تحریک شروع کروا دی جس سے حکومت کے خلاف عوام الناس اور قومی ادارے صف آراء ہو گئے۔اس طرح انہوں نے حکومت کو دباؤ میں رکھا۔

## سردار سکندر اور الیکشن 2001

2001 کے اسمبلی الیکشن کے بعد سکندر صاحب دوبارہ وزیراعظم اور سردار محمد انور خان جو پاکستان فوج میں میجر جنرل تھے، ریٹائرمنٹ لے کر صدر منتخب ہوئے۔سکندر صاحب اس عرصہ کے دوران فوج کی طرف سے آزاد کشمیر کے محض صوبے دار میجر لگتے تھے۔ان میں پہلی مدت جیسی تڑ اور Initiative نہیں تھا۔ان کو مقامی ملٹری انٹیلی جینس' آئی ایس آئی کے کمانڈر اور مری کے جی او سی کنٹرول کرتے تھے۔ہر ماہ ان کو مری میں حاضری دینا پڑتی تھی۔وہ بات کرنے اور سمجھانے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔انہوں نے اس پر ایک بیان دیا کہ اب ان میں مری کی سیڑھیاں چڑھنے کی ہمت نہیں رہی ہے۔ اس بیان نے سیاسی ورکرز کے حوصلے بلند کیے۔اس عرصہ کے دوران مظفرآباد سرینگر بس سروس بھی شروع ہوئی جس کا سارا اہتمام ایجنسیوں نے کر کے اس کو آزاد کشمیر حکومت کے ساتھ منسوب کیا۔جبکہ حکومت کے سارے کاریگر اس سے بے خبر تھے۔

میں اس عرصہ کے دوران چیف الیکشن کمشنر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔میں نے شناختی کارڈ کی بنیاد پر کمپیوٹرائزڈ جدید ووٹر لسٹیں بنانے کا اہتمام کیا جس پر میں نے ساری سیاسی جماعتوں اور حکومتی عمائدین کو اعتماد میں لیا۔ساتھ ہی مہاجرین کی نشستوں پر ریاستی باشندہ سرٹیفکیٹ کی شرط لگائی اور 1990 کے بعد آنے والے کشمیری مہاجرین کو ووٹ کا حق بھی دیا۔مہاجرین ممبران اور مقامی ایجنسیوں نے باہمی سازش سے اصلاحات نہیں ہونے دیں اور میرے خلاف اسمبلی میں عدم اعتماد کی قرارداد پاس کروائی۔مجھے حیرت ہوئی کہ جن لوگوں نے بشمول سکندر حیات، چوہدری عبدالمجید







اور سردار عتیق خان اس سے اتفاق کیا تھا انہوں نے اس قرارداد میں اہم ترین کردار ادا کیا۔سکندر صاحب نے مجھے اس سے پہلے اپنے دفتر میں چیف سیکریٹری کاشف مرتضیٰ کی موجودگی میں میٹنگ کی اور کہا کہ میں اس طرز پر ووٹر لسٹ نہ بناؤں۔جب میں نے ان کو کہا کہ آپ کے مشورے کے بعد ایسا کیا ہے تو اس پر انہوں نے کہا کہ اب بھی میں یہی کہہ رہا ہوں۔میں نے ان سے کہا کہ میں سیاست دان نہیں کہ اپنی بات سے پھر جاؤں۔اس پر ہماری تلخی ہوئی لیکن چیف سیکریٹری نے معاملہ کو ٹھنڈا کر دیا۔ میرے خیال میں سکندر صاحب نے مہاجرین ممبران اسمبلی اور مقامی ایجنسیوں کے دباؤ پر ایسا کیا جن کی ریاض اختر چوہدری کے ساتھ اس معاملے میں مکمل انڈرسٹینڈنگ تھی۔

ان ہی کی حکومت کے دوران 2005 میں قیامت خیز زلزلہ بھی آیا جس میں مظفرآباد اور باغ کے قصبوں میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور کھربوں کی جائیداد کا نقصان ہوا۔حکومت تو انہی کی رہی، لیکن اس عرصہ کے دوران ریاست کا مکمل نظام فوج نے سنبھال لیا تھا۔وزیراعظم محض انگوٹھا لگانے کا کام کرتے رہے۔چوں کہ ایک قومی افتاد اور المیہ تھا، سول حکومت اور وہ بھی ایجنسیوں کی دی ہوئی حکومت کے بس کی یہ بات نہیں تھی کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔سکندر صاحب نے زلزلہ کے اگلے روز ایک بیان دیا کہ ''میں قبرستان کا وزیراعظم ہوں۔'' گو کہ زلزلہ کی تباہ کاریوں کی اس سے زیادہ بہتر الفاظ میں عکاسی نہیں ہو سکتی تھی، تاہم یہ ان کی بے بسی کا بھی اظہار تھا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی ذاتی حیثیت کیا تھی۔

2006 کے الیکشن ان کی حکومت کے دوران ہوئے جس میں مسلم کانفرنس نے اکثریت حاصل کی۔یہ اکثریت دراصل جنرل ظہیر السلام، جنرل اعجاز ندیم، بریگیڈیئر غضنفر اور ریاض اختر چوہدری کے ہاتھ کی صفائی تھی۔انہوں نے ایسا ماحول پیدا کیا جس کے بطن سے ان کے پسندیدہ عتیق احمد خان پیدا ہوئے جنہوں نے زلزلہ کے دنوں میں مقامی ایجنسیوں کے اہلکاروں سے مل کر ہاتھ کی مکمل صفائی دکھائی۔اس الیکشن میں سکندر صاحب اپنے آبائی حلقہ سے عتیق، ریاض اور بریگیڈیئر غضنفر کی ملی بھگت سے اپنے بیٹے کی نشست بھی نہ نکال سکے اور آزاد کشمیر کی سیاسی تاریخ میں پہلی بار انہوں

نے یہ نشست اپنے روایتی حریفوں کے ہاتھوں کھو دی۔ اس میں ان کے خاندان کے خلاف مخالف خاندان اور لوگوں کا غصہ اپنی جگہ، لیکن عتیق خان کی کارفرمائی بالکل عیاں تھی۔ یہ ایسا الیکشن تھا جس میں دھاندلی کا الزام نہ صرف ہارنے والوں نے لگایا بلکہ جیتنے والے بھی یہ پیٹتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس الیکشن کے نتیجے میں وجود میں آنے والی اسمبلی نے چار بار وزیراعظم بدلے۔

اس عرصہ کے دوران پاکستان میں عتیق خان کے مربی اور محسن، جنرل مشرف وکلاء تحریک کے نتیجے میں فارغ اور پیپلز پارٹی کے سید یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بنے، جن کا دست شفقت بھی عتیق خان پر تھا۔ اس سلسلے میں ان کے ساتھ مضبوط ترین رابطہ کار راجہ ذوالقرنین تھے جو فوج میں اثر رسوخ کی وجہ سے آزاد کشمیر کے صدر منتخب ہوئے اور یوسف رضا گیلانی کے ساتھ کسی طریقہ سے رشتہ میں منسلک تھے۔ سکندر صاحب اس عرصہ کے دوران سیاسی طور پر تقریباً پس منظر میں چلے گئے لیکن سیاسی طور مسلم لیگ (ن) کے آزاد کشمیر کے قیام میں سرگرم ہو کر آزاد کشمیر کے قومی دھارے میں شامل ہونے کے داعی بن گئے۔ ان کی کوشش 2010 میں مسلم لیگ (ن) کے قیام پر منتج ہوئیں۔ میاں محمد نواز شریف نے انہیں مسلم لیگ (ن) آزاد کشمیر کا سرپرست اعلیٰ/ چیئرمین قرار دیا۔ میں نے آزاد کشمیر میں قیام کے دوران صرف جنرل حیات خان اور سکندر حیات خان کو بہترین منتظم پایا۔ لیکن حیات خان اس معاملہ میں سبقت رکھتے ہیں کہ ان کے خلاف کنبہ پروری اور کرپشن کے الزام بھی نہیں لگے۔

## ممتاز حسین راٹھور

راٹھور صاحب ذاتی طور پر بہت ہی اچھی عادتوں کے مالک، دیانتدار، بے لوث، دوستوں کے دوست اور کسی کے دشمن نہیں تھے۔ کوئی شخص ان پر ایک پیسے کی بددیانتی کا الزام نہیں لگا سکتا۔ دوستی یاری میں کچھ بھی کر سکتے تھے اور کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ گو کہ خود وکیل تھے لیکن زیادہ تر کام تعلق واسطہ اور اثر ورسوخ سے کرواتے تھے۔ ان کو زیادہ تر مقدمات کی تیاری، میں اور چیف جسٹس ریٹائرڈ خواجہ محمد سعید صاحب کروایا کرتے تھے، وہ محض عدالت میں بولتے تھے لیکن ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ







عدالت کو انگیج کر لیتے تھے اور اپنی شیریں بیانی اور بذلہ سنجی سے اپنے کام کروا لیتے تھے۔ ججوں کے مزاج کو جانتے تھے اس لیے ان کے مزاج کے مطابق ہی بات کرتے اور ویسا ہی موکلان کو کرنے کو کہتے۔

ایک دن ان کا کیس مرحوم چیف جسٹس سردار محمد شریف خان کے پاس لگا ہوا تھا۔ اغوا کے مقدمہ میں عبوری ضمانت کی توثیق کی درخواست پر بحث ہونی تھی۔ انہوں نے اپنے موکل کو کہا کہ کپڑے پرانے اور میلے پہن کر آؤ اور مونچھیں بھی کٹواؤ۔ سردیوں کا موسم تھا اس کو کہا کہ اوپر میلی سی اوڑھنی بھی لپیٹ کر آؤ، ورنہ تمہاری مونچھیں اور لباس اور چال دیکھ کر سردار شریف صاحب ضمانت نہیں کریں گے۔ سردار صاحب تھانیدار قسم کے آدمی تھے اور ایسے مقدمات کو انتہائی ہی سنجیدگی سے لیتے تھے۔ چنانچہ موکل نے ایسا ہی کیا۔ عدالت میں راٹھور صاحب نے سردار صاحب کو کہا کہ جناب میرے موکل کو دیکھیں، یہ شکل وصورت اور وضع قطع سے ایسا لگتا ہے کہ اغوا کرے؟ سردار صاحب نے اس کی جانب غور سے دیکھا اور دوسرے شخص کی جانب بھی دیکھا جو کہ عدالت میں مستغیث مقدمہ تھا اور بڑا زرق برق سا لباس پہنے عدالت میں موجود تھا۔ سردار صاحب نے دونوں کا بغور جائزہ لے کر کہا، یہ وہ (یہ ان کا تکیہ کلام تھا) کہ لگتا ہے اس فقیر کو پھنسانے کے لیے مونچھوں والے نے مقدمہ بنایا ہے اور ضمانت کنفرم کر دی۔

راٹھور صاحب کی حس مزاح کمال کی تھی۔ ہر بات سے لطیفہ گھڑ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ جسٹس خواجہ سعید صاحب سمیت جسٹس ریٹائرڈ راجہ خورشید صاحب کے چیمبر میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سعید صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ صاحب ایک ریٹائرڈ جج کی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ اصل جج تو وہ ہوتا ہے جو حاضر سروس ہو اور نفع اور نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتا ہو، اس کی کیا تعریف کرنی جو کہ ریٹائرڈ ہو چکا ہو اور کوئی فائدہ بھی نہ دے سکتا ہو۔ چلو راجہ صاحب کی تعریف کریں جو کہ تعریف کے قابل بھی ہیں اور حاضر سروس بھی۔

راٹھور صاحب چوں کہ میری ہمسائیگی میں رہتے تھے، اس لیے ان کے بچے اکثر میرے ہی

گھر میں رہتے تھے۔ایک دن انہوں نے ان کے ایک سیاسی ورکر کے باپ کی فوتگی کے گھر افسوس کرنے کے لیے جانے کو کہا۔ میں نے ان کو کہا کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ وہ لوگ کہیں گے کہ میں آپ کی وجہ سے افسوس کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کی گاڑی میں جاؤں گا، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو انہوں نے اس شخص کو پہلی بات یہی کہی کہ گیلانی صاحب آنے کے لیے نہیں مان رہے تھے، میں ان کو زبردستی لے کر آیا ہوں کیوں کہ میرے پاس گاڑی نہیں تھی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ میرا بڑا بیٹا خالد جس کی عمر اس وقت بارہ یا تیرہ برس کی تھی، وہ شکار کرنے کا شوقین تھا۔ گھر سے شکار کے لیے نکل گیا اور رات بھر واپس نہیں آیا۔ ہمیں گمان ہوا کہ اس کو کسی نے اغوا کر لیا ہے یا مار ڈالا ہے۔ ہم سب لوگوں پر ماتم کی کیفیت طاری تھی۔ میرے گھر ہزاروں لوگوں کا مجمع جمع تھا۔ راٹھور صاحب نے مجھے کہا کہ گیلانی صاحب کیوں پریشان ہو رہے ہو، میرے گھر سے جس عمر، جس رنگ اور جس نسل کا بچہ چاہیے اٹھا کر لے آؤ بلکہ دو تین لے آؤ۔

مظفر آباد مسلم کانفرنس کے دیرینہ اور کہنہ مشق ورکر غلام علی کے فوت ہونے پر انہوں نے معلوم کیا کہ جنازے کی نماز کس وقت ہوگی؟ تو بتایا گیا کہ سردار صاحب کے آنے پر۔ اس پر انہوں نے مسلم کانفرنسی رہنما راجہ ابرار احمد خان ایڈووکیٹ پر جملہ کستے ہوئے کہا کہ سردار قیوم تمام مسلم کانفرنسیوں کی نماز جنازہ پڑھا کر ہی مرے گا۔ تم پی پی میں آجاؤ، جس کے قائد نے اپنی جان دے کر ورکروں کی جان بچائی ہے۔ ایک دفعہ سردار قیوم صاحب کے بارے میں فقرہ کستے ہوئے کہا کہ اگر سردار صاحب اپنے عاشق رسول ﷺ ہونے کے دعوے میں سچے ہیں تو وہ 63 سال کی عمر میں یقینا مر جائیں گے۔ انہوں نے ایک دفعہ ایران کے دورے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب ان لوگوں کی وہاں شراب کے ساتھ تکوں سے تواضع کی گئی۔ اس پر ویٹر سے پوچھا، یہ چمکیلے سرخ تکے کس کے ہیں؟ اس نے جواب دیا ''پورک''، یعنی سؤر کے۔ اس پر میں نے اس کو کہا، ہم مسلمان ہیں۔ لیکن ویٹر نے یہ جواب دے کر لاجواب کر دیا کہ دونوں حرام ہیں۔ چھوڑنا ہے تو دونوں چھوڑ دیں۔ 1991 میں جب سردار عبدالقیوم صاحب وزیر اعظم تھے اور راٹھور صاحب اسمبلی کے ممبر تو کہا





کرتے کہ اللہ کا شکر ہے ہم نے سردار صاحب کا اصلی روپ دیکھ لیا، ورنہ ان کے مرنے پر ہم ان کو ولی سمجھ کر ان کے مزار بناتے اور عقیدتمند پوجتے بھی۔ بحیثیت وزیر اعظم ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک فقیر نے میرے سامنے مالی امداد کے لیے ایک درخواست رکھی لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اور میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔ فقیر نے کہا کہ آپ میری درخواست پر لکھیں دل پر ہاتھ میں رکھ لوں گا۔ بس میں سفر کرتے ہوئے اپنے ساتھ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک سگریٹ پینے والے کو کہا کہ اگر تم مجھے سگریٹ نہیں دے سکتے، دھواں کم از کم میری طرف پھینکو تا کہ میرا نشہ بھی پورا ہو جائے۔

موصوف مرنجان مرنج شخص تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔ جوان مرگی ہوگئی ہے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ 1991 میں اپنے آبائی حلقہ کے علاوہ مظفر آباد سے بہ یک وقت اسمبلی کے لیے کامیاب ہوئے جبکہ سردار قیوم صاحب اور عتیق خان کا بیٹا یکے بعد دیگرے ناکام ہوئے۔ سردار محمد ابراہیم خان مرحوم کے بعد راٹھور صاحب وہ بڑے عہدے دار تھے جن کو حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کے آئین کا غلط استعمال کرتے ہوئے برطرف کیا۔ مرتے دم تک ہر دلعزیز رہے۔ ایک دفعہ انہوں نے ازرہ مذاق کہا تھا کہ میں سردار عبدالقیوم خان کی طرح نہیں کہ 63 سال سے زیادہ عمر پاؤں کیوں کہ یہ میرے نبی ﷺ کی حتمی عمر تھی۔ اتفاق کی بات ہے، وہ تقریباً اسی عمر میں 16 جولائی 1999 کو صبح چھے بجے محمود گلی تحصیل حویلی کے ریسٹ ہاؤس میں وفات پا گئے جن کا مقبرہ دھڑے راجگان پلنگی میں ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

1990 کی اسمبلی کی تحلیل پر جس نے ان کو وزیر اعظم بھی منتخب کیا تھا، جب میں نے ان سے پوچھا کہ راٹھور صاحب آپ نے اسمبلی تحلیل کر کے اپنی پارٹی میں اپنا مقام بھی متاثر کیا اور ریاست اور لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دیا اگر آپ کو کیبنٹ سے شکایت تھی تو نئی کیبنٹ بنا دیتے اور ان کو فارغ کر دیتے۔ کہنے لگے، میرے ساتھ سارے بلیک میلر تھے۔ میں نے سوچا کہ ان حرامیوں کو پیدل گھر

بھیج کر خود تین مہینے تک اس گاڑی میں سوار رہوں گا۔

ان کے لطیفے ختم ہونے کو نہیں آ سکتے۔ بہرحال تمام تر صلاحیتوں کے باوجود وہ اپنی پارٹی کا اعتماد بحال نہیں رکھ سکے۔ راٹھور صاحب کو حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر آئین کی دفعہ 56 کے تحت برطرف کر کے سردار محمد اشرف خان کو جو اس وقت چیف الیکشن کمشنر تھے، منتظم اعلیٰ مقرر کیا۔ راٹھور صاحب کی برطرفی اور سردار اشرف کی تعیناتی ہر دو غیر آئینی عمل تھے۔ لیکن آزاد کشمیر کا پاکستان کے اندر کوئی آئینی مقام نہ ہونے کی وجہ سے ایسا اس وقت تک ہوتا رہے گا، جب تک آزاد جموں و کشمیر کے لوگوں کو پارلیمنٹ آف پاکستان میں براہ راست نمائندگی کا حق نہیں ملے گا۔ دفعہ 56 کا اطلاق حکومتوں کی برطرفی کے لیے نہیں بلکہ ان اقدام کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جس پر حکومت پاکستان قانون سازی کر سکتی ہے۔

راٹھور صاحب کے فیصلے جذبات پر مبنی ہوتے تھے۔ پہلے 1991 میں اپنی وزارتِ عظمیٰ اور اسمبلی ختم کروائی پھر بیرسٹر سلطان محمود کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران 1996 سے 2000 تک کی اسمبلی میں سپیکر شپ سے عدم اعتماد کی وجہ سے محروم ہوئے اور بالآخر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کی سرگرمیوں میں انتہائی تھکاوٹ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میرے استعفیٰ دینے کے بعد ان کے وزیراعظم بننے تک ایڈووکیٹ جنرل کا عہدہ خالی تھا۔ انہوں نے مجھے اس پر تقرری کے سلسلے میں پیشکش کی۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ اس پر آپ اپنی پارٹی کے کسی اچھے وکیل کی تقرری کر دیں جس کے بعد انہوں نے چاچا علی محمد ایڈووکیٹ مرحوم میر پور کو ایڈووکیٹ جنرل مقرر کیا۔ ایڈووکیٹ جنرل حکومتی پارٹی کا معتمد ترین شخص ہونا چاہیے۔ یہ نوکری نہیں بلکہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ پیشکش بھی ان کا جذباتی عمل تھا کیوں کہ میرا تعلق ان کی جماعت سے نہیں تھا۔

آزاد کشمیر کے ذہین ترین، ظریف ترین، بے تکلف، قادر الکلام، حاضر جواب، بے باک اور نڈر سیاسی ورکر تھے جن کی خوبیوں اور دوستی پر ہر کوئی مان کرتا تھا۔ ان کی دیانت پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہائپر ٹینشن کا شکار تھے جس وجہ سے جلد غصہ میں آ جاتے تھے۔ 1975 کی اسمبلی کے ممبر منتخب







ہو کر آزاد کشمیر کے متحرک اور فعال ترین وزیر قانون بھی رہے۔ 1976 میں جب میں کشمیر سے آیا تو میرا کسی دوست نے ان سے تعارف کرایا۔ ان کی اہلیہ محترمہ میرے ایک دوست راجہ خورشید احمد خان مرحوم کی کزن ہیں جس وجہ سے ان سے تعلقات استوار ہوئے۔ بحیثیت وزیر قانون مجھے اس زمانے میں زیر تعمیر اسمبلی ہال اور ہوسٹل دکھانے کے لیے لے گئے اور ہال کے دروازے پر پہنچتے ہی کہا کہ یہ بلڈنگ ہمارے لیے شداد کی جنت ہی نہ بنے، آج ہی دیکھ لوں۔ اتفاقاً ایسا ہی ہوا اور 1990 تک ان کو اسمبلی کا منہ تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ جب سردار عبدالقیوم صاحب نے 1990 میں وزیراعظم منتخب ہونے پر ان کو حلف دینے سے انکار کیا تو انہوں نے کہا کہ ''جس محلے میں مرغا صبح کی اذان نہ دے، وہاں بھی صبح ہو جاتی ہے۔ سردار قیوم کے حلف نہ دینے سے یہ عمل رک نہیں سکتا۔''

## بیرسٹر سلطان محمود

بیرسٹر سلطان محمود میر پور کے مشہور سیاسی اور سماجی رہنما چوہدری نور حسین مرحوم کے بیٹے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں اور والد کے بھرپور تعاون سے آزاد کشمیر کی سیاسی زندگی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ 1996 سے 2001 تک کے پُرآشوب دور میں آزاد کشمیر کے وزیراعظم رہے جس عرصہ کے دوران پاکستان میں یکے بعد دیگرے پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن) اور جنرل مشرف کی حکومتیں رہیں۔ ان متضاد الخیال پاکستانی حکمرانوں کے ساتھ ایک جیسے تعلقات تھے۔ مصلحت اور مصالحت ان کا نصب العین رہا۔ اپنی تشہیر کی مہارت رکھتے اور باقیوں سے نمایاں رہنے میں ممتاز رہتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے رہے۔ کشمیر کے نام پر بھرپور سیاست کرتے ہیں۔ اپنے اور اپنی برادری کے خرچے پر وہ سب کچھ کرتے ہیں جو کہ آزاد کشمیر اور پاکستان کے باقی لیڈر سرکاری خرچے پر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا بھر میں کشمیر کے مسئلہ پر سیاست کرتے ہیں، سفارتکاروں سے تعلقات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ سردار عتیق احمد خان کی طرح سکیوریٹی ایجنسیز کے ساتھ خصوصی تعلقات رکھتے ہیں اور ان سے فال نکلوائے بغیر کوئی سیاسی قدم نہیں اٹھاتے۔ اپنا Initiative رکھے بغیر Issues کو بھرپور Exploit

کرتے ہیں۔ان کا دامن کرپشن، بدعنوانی اور بددیانتی سے پاک ہے۔بحیثیت وزیراعظم کبھی ناانصافی یا اداروں میں مداخلت نہیں کی اور نہ سیاسی انتقام لیا۔جیو اور جینے دو کے اصول پر قائم رہے۔کسی سے بغض، عداوت یا کینہ نہیں رکھتے۔سردار عبدالقیوم خان مرحوم کی طرح کشمیر کے مسئلہ کو اپنی سیاست اور اقتدار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے سرینگر کشمیر کا دورہ کیا جو ان کا طرۂ امتیاز ہے۔1990 سے آج تک تسلسل کے ساتھ آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں جس عرصہ کے دوران وزیراعظم اور قائد حزبِ اختلاف بھی رہے۔

تمام تر خوبیوں کے باوجود بیرسٹر صاحب حکومت اور جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے پارٹیاں بدلنے میں یکتا ہیں، یا پھر یہی ان کی مستقل مزاجی ہے! موصوف آزاد مسلم کانفرنس سے پیپلز پارٹی وہاں سے پیپلز مسلم لیگ پھر پیپلز پارٹی اور پاکستان تحریک انصاف میں شامل ہوئے۔2015 میں اسمبلی رکنیت سے استعفیٰ دے کر پاکستان تحریک انصاف میں شامل ہوئے اور دوبارہ اسی نشست پر پیپلز پارٹی کے بالمقابل الیکشن لڑکر دوبارہ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔لیکن 2016 کے جنرل الیکشن میں تحریک انصاف کے صدر ہونے کے باوجود اسمبلی کی نشست ہار گئے۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ خود اور ان کے آبائی حلقہ کے ووٹر اس عمل کو برا بھی نہیں سمجھتے۔غالباً یہ بیرسٹر صاحب کے اچھا ہونے کی دلیل یا ووٹروں کے نزدیک ان کے اچھا ہونے کی علامت ہے۔

## راجہ فاروق حیدر خان

راجہ فاروق حیدر خان آزاد کشمیر ضلع مظفرآباد کے نامور باوقار اور جرأت مند سیاسی لیڈر راجہ محمد حیدر خان مرحوم کے بیٹے ہیں۔وہ آزاد کشمیر اسمبلی کے کئی بار ممبر منتخب ہوئے ہیں۔آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس میں اپنے والد محترم کی طرح نمایاں پوزیشن اور اثر ورسوخ رکھتے تھے۔جرأت اور بے باکی کی وجہ سے باقی لیڈر شپ ان سے خائف رہتی ہے۔سردار سکندر حیات خان نے ان کو آگے آنے اور بڑھنے کا بھرپور موقع دیا اور 1985 سے 1990 تک آزاد کشمیر اسمبلی میں سینئر وزیر اور







اس حیثیت سے کئی بار قائم مقام وزیراعظم کے فرائض انجام دیئے۔2009 میں اپنی صلاحیتوں کے پیش نظر آزاد کشمیر کے وزیراعظم منتخب ہوئے لیکن چند ماہ ہی رہنے کے بعد تحریک عدم اعتماد کے ذریعے برطرف کیے گئے۔اس برطرفی میں سردار عتیق احمد کا نمایاں کردار تھا۔اپنی وزارت عظمیٰ کے عرصہ کے دوران اس وقت کے چیف جسٹس چوہدری ریاض اختر کے خلاف ریفرنس دائر کر کے بے پناہ شہرت پائی اور لوگوں کے دلوں پر چھا گئے۔آزاد کشمیر کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام اور مقام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔میرے خیال میں ان کے سیاسی نامہ اعمال میں یہ عمل سب سے زیادہ بھاری ہے۔اس عمل کے بعد لوگ فاروق حیدر خان کو ایک سنجیدہ شخص سمجھنے لگے جس نے ان کو عام ورکر سے لیڈر بنا دیا۔اس کو بحال رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

ذاتی طور پر دیانت دار اور جرأت مند آدمی ہیں۔قیادت کی ساری صلاحیتوں کے حامل ہیں۔اگر طبعی سستی، لاپرواہی سطحی رویہ اور غیر سنجیدگی پر قابو پائیں اور آزاد کشمیر کی جوں کی توں صورت کو بدلنے کی کوشش کریں، جو ان کی سوچ ہے، تو ان کے پائے کا کوئی دوسرا آدمی آزاد کشمیر میں مشکل سے ہی پایا جائے گا۔ان کی تگ و دو نے آزاد کشمیر میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کا قیام ممکن بنایا اور 2010 میں اس کے قیام پر اس کے پہلے صدر قرار پائے۔2011 کے الیکشن میں پارٹی کے قیام کے صرف چھے ماہ کے اندر 12 نشستیں حاصل کر کے اپنی قیادت کا لوہا منوایا۔آزاد کشمیر کو قومی دھارے میں شامل کرنے میں خاصی خواہش رکھتے ہیں لیکن اس کا بھرپور مظاہرہ نہیں کرتے۔اپنے ہم عصرین میں سے سردار خالد ابراہیم، عبدالرشید ترابی کے ہم خیال ہیں۔اگر یہ تین لوگ ایک ٹیم کی طرح کام کریں تو آزاد کشمیر میں بامعنی تبدیلی آسکتی ہے کیوں کہ تینوں دیانت دار اور جرأت مند سیاسی ورکر ہیں۔2011 کے اسمبلی کے الیکشن میں فاروق حیدر اپنے حلقہ انتخاب اور مظفرآباد شہر سے بہ یک وقت الیکشن جیتے جو اُن کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔یہ اعزاز ان سے پہلے راجہ ممتاز حسین راٹھور کو حاصل ہوا تھا جب وہ 1991 کے الیکشن میں حویلی اور مظفرآباد سے بہ یک وقت کامیاب ہوئے جبکہ سردار قیوم صاحب جیسے بڑے لیڈر بھی نسلوں سمیت دو بار مظفرآباد کے حلقہ سے ہار گئے تھے۔2016 کے الیکشن

میں راجہ فاروق حیدر نے مسلم لیگ (ن) کی کامیابی کے لیے بے انتہا محنت کی اور بالآخر مرکزی حکومت کی مدد سے آزاد کشمیر میں جماعت کے لیے ریکارڈ توڑ کامیابی حاصل کر کے خود وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ان کی اس ریکارڈ توڑ کامیابی میں نصف سے زیادہ پیپلز پارٹی کی حکومت کی نااہلی اور مرکز میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت کا حصہ ہے۔ بقیہ ان کا ٹیم ورک ہے۔ تادمِ تحریر ان کے خلاف کسی بد انتظامی کا الزام سامنے نہیں آیا لیکن اپنی سوچ اور فکر کے مطابق سیاسی اور آئینی سطح کا کوئی Initiative بھی نہیں لیا۔ ان پر راجہ ازم کا الزام بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ وہ فوج، بیوروکریسی اور سفارت کاری میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے میں میرٹ کے نام پر ان سروسز کے اپنے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں کو Tenure Posts پر تعینات کر رہے ہیں جس سے یہ تاثر دینے کی کوشش ہے کہ وہ میرٹ پر غیر جانب دار لوگوں کو آگے لا رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بھی حسب سابق اپنی بہتر پوزیشنز پر بحال رکھا ہے جو بظاہر ان کی سابق حکومت کے ساتھ مفاہمت کا غماز ہے۔

میاں محمد نواز شریف سابق وزیر اعظم پاکستان کو سپریم کورٹ پاکستان نے اس مفروضے پر ''صادق اور امین'' نہ ہونے کی بنا پر نااہل قرار دیا کہ انہوں نے اپنے الیکشن کے گوشواروں میں وہ رقم ظاہر نہیں کی جو ان کے بیٹوں کی کمپنی نے ان کو دی لیکن انہوں نے وصول نہیں کی۔ یہ ایک مضحکہ خیز دلیل ہے۔ اس کے خلاف بیان دیتے ہوئے فاروق حیدر نے کہہ دیا کہ وہ ''سوچ کر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ وہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے پاکستان کو ووٹ دیں یا عمران خان کے پاکستان کو۔'' اس پر اس کے خلاف عمران خان، شیخ رشید اور ان کے حامیوں کے علاوہ آزاد کشمیر میں ان کے مخالفوں نے آڑے ہاتھوں لے لیا کہ یہ الحاقِ پاکستان کے عقیدے سے غداری ہے اور وہ نااہل ہو چکے ہیں۔ حالاں کہ اس نے اس حد تک کوئی غلط بات نہیں کی کہ وہ ''سوچ کر فیصلہ کریں گے۔'' ظاہر ہے ریاست کے لوگوں کے پاس سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق ہندوستان اور پاکستان دو آپشن ہیں، اس میں تو سوچ کر ہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اس میں کون سی غداری ہے؟ آزاد کشمیر میں اس فتنہ انگیز قانون نے آزاد کشمیر کے لوگوں کو تقسیم کر دیا ہے، وگرنہ ہندوستانی کشمیر کے لوگوں کی کوئی چوائس نہیں ہے۔ بہر حال فاروق حیدر کی





یہ بات بے موقع اور بے محل تھی، جو غلط نہیں تھی لیکن اس موقع کی مناسبت سے درست نہیں تھی۔ یہ فاروق حیدر کی جذباتیت کا غماز ہے۔

## سردار عتیق احمد خان

سردار عتیق، سردار عبدالقیوم خان صاحب کے فرزند اور ان کے سیاسی جانشین ہیں۔ بہت ہی متحرک، تیز طرار اور قادر الکلام شخص ہیں۔ فصاحت و بلاغت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ والد صاحب کی وجہ سے بچپن سے ہی اچھی اور اعلیٰ طبقہ کی صحبت میسر آئی جس کی وجہ سے پاکستان کی سیاست کے داؤ پیچ سمجھنے کے ماہر ہیں۔ بچپن سے ہی والد صاحب کے حوالے سے فوجی حکمرانوں کی قربت حاصل رہی جو پاکستان کی سیاست کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ عتیق صاحب کو ان کا بھرپور اعتماد حاصل تھا اور یہ بھی والد صاحب کی طرح سیاسی ورکر کی بجائے فوجی سپاہی کہلانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ جو آزاد کشمیر کے اقتدار کا زینہ ہے۔ عتیق خان نے تو جمہوری حکومت میں فوج کو باضابطہ حصہ دار بنانے کے لیے ''ملٹری ڈیموکریسی'' کا بے سروپا فلسفہ گھڑا ہے۔ ملٹری ڈیموکریسی کہنا ایسا ہی ہے جیسے چوری کے مرغ پر تکبیر پڑھ کر کھانا حلال سمجھا جائے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی اور ان کے بعد راحیل شریف کے سپہ سالار فوج بننے کے بعد فوج کی سول معاملات اور سیاست میں عملی مداخلت اور سیاست دانوں کے چاہنے کے باوجود، ان کی فوج میں بھرتی بند ہو گئی، اس لیے عتیق خان کے لیے یہ ایک Set Back ہوا ہے لیکن ہر چڑھتے سورج کے ساتھ ہی اس امید میں ہوتے ہیں کہ فوج کی حکومت آئے گی۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کا منتہائے نظر ہے۔

آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت میں عتیق خان 1985 کے بعد آئے لیکن عملی طور پر 1991 کے بعد اس پر قابض ہوئے جب سردار عبدالقیوم صاحب آزاد کشمیر کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ 1991 سے 1996 تک سردار عتیق خان عملی طور پر وزیر اعظم تھے، حتیٰ کہ روزمرہ کی سرکاری فائلوں پر خود سردار عبدالقیوم صاحب کے دستخط کرتے تھے۔ ان کے اتھل پتھل کی وجہ سے سردار صاحب کا امیج بہت خراب

ہوا۔

موصوف انتھک، متحرک اور جاذبِ نظر شخصیت ہیں۔ اگر موصوف اپنی ذہانت، معاملہ فہمی، بلاغت اور تعلقات کے پس منظر میں اپنی صلاحتیں مثبت طرزِ فکر پر مرکوز کریں تو یقیناً اپنے ہم عصرین کو پچھاڑ سکتے ہیں، لیکن انتقامی سیاست اور ناانصافیوں پر مبنی سوچ سے جب تک تائب نہیں ہوں گے، ممکن ہے اقتدار حاصل کریں لیکن وہ مقام حاصل نہیں کر سکیں گے جو اتنی صلاحیتوں والا آدمی کر سکتا ہے۔ 1991 والی سردار صاحب کی حکومت کے دوران عتیق کمیشن کے نام سے بدنام ہوئے جس کے تحت سینکڑوں ورکرز کو بلا میرٹ نوکریاں دیں جن کو عدالتوں نے کالعدم قرار دیا۔ توہین عدالت کے الزام اور سزا سے بچنے کے لیے جھوٹ بول کر اپنے ایک بہترین ورکر فدا کیانی کو قربانی کا بکرا بنایا۔ اپنے والد کے برعکس برادری کی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ جنرل مشرف کے فدائین کا دعوے دار ہونے کے باوجود 2013 میں جنرل کے پاکستان آنے پر کنارہ کشی کر لی۔ آزاد کشمیر میں مسلم لیگ کے قیام کی وجہ سے ان کی سیاسی پشت پناہی کو بہت دھچکا لگا کیوں کہ آزاد کشمیر میں یہ مسلم لیگ کے قائم مقام کے طور پر سیاست کرتے رہے ہیں۔ مسلم کانفرنس کو ریاستی جماعت کے دعوے کے ساتھ ملکی جماعتوں کو غیر ریاستی جماعتیں کہتے اور ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ حالاں کہ کشمیر بنے گا پاکستان اور کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے، کا راگ الاپتے ہیں لیکن کشمیر کے اندر قوم پرست جماعتوں کو خوش رکھنے کے لیے ریاستی اور غیر ریاستی جماعتوں کی تخصیص کرتے ہیں جو فی الواقع لوگوں کو پاکستان سے دُور کرتی ہے۔ اس طرح قوم پرستی جس طریقہ سے یہ پروان چڑھا رہے ہیں، وہ علیحدگی پسندوں کے قریب تر ہے۔

## سردار خالد ابراہیم خان

سردار خالد ابراہیم خان، سردار محمد ابراہیم خان کے بیٹے ہیں جو اپنی جماعت جموں و کشمیر پیپلز پارٹی کے سربراہ بھی ہیں۔ انتہائی با اصول اور شریف النفس شخص جو جمہوریت، انصاف اور باوقار، اداروں کی تعمیر و توقیر کی آزاد کشمیر میں آخری آواز ہیں۔ انہوں نے سردار عبدالقیوم خان صاحب کی





حکومت کے دوران عتیق کمیشن کے ذریعہ بھرتی ہونے والے لوگوں کی اسمبلی[230] کے ذریعہ توثیق پر اسمبلی کی رکنیت سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا تھا جو کوئی نہیں کرتا۔ جب ریاض اختر کو مجھ پر جونیئر ہونے کے باوجود ترجیح دے کر چیف جسٹس بنایا گیا تو وہ واحد ممبر اسمبلی تھے جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اسمبلی میں تحریک استحقاق پیش کی۔ والد صاحب کے نام یا صدارتی عہدے سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس سارے عرصہ کے دوران رات کبھی صدارتی ہاؤس میں نہیں گزاری۔ ان کی جماعت میں شامل ہونے کے لیے اس وقت کی سیکریٹری جنرل نبیلہ نے اسلام آباد گھر آ کر مجھے دعوت دی تھی۔ لیکن میں مقامی لیول کی جماعتوں میں شامل ہونا پسند نہیں کرتا کیوں کہ مقامی جماعتیں مقامی سوچ پیدا کرتی ہیں اور ورکرز کی نشوونما رک جاتی، جان پہچان محدود ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ مجھے مسلم کانفرنس میں رہ کر ہوا ہے، لیکن اگر کسی مقامی جماعت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرتا تو وہ خالد ابراہیم کی جماعت ہی ہوتی۔ نا انصافی کے خلاف آواز بلند کرنا ان کی سرشت میں شامل ہے، فیصلہ کرتے ہیں اور تنقید بھی برداشت کرتے ہیں۔ ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کی تکمیل کسی تحریک میں نہیں بدل سکے لیکن اس کے خلاف سوچ پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ 2016 کے اسمبلی الیکشن میں بھی 2011 کی طرح مسلم لیگ کے اتحادی تھے۔ اپنی نشست حاصل کرنے کے علاوہ مسلم لیگ کی کامیابی میں بھرپور کردار ادا کیا لیکن اتحادی جماعت سے مبینہ معاہدے کی خلاف ورزی کی بنا پر حکومت بننے کے فوراً بعد اتحاد توڑ کر احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ مسلم لیگ کی طرف سے مسعود خان سابق سفارت کار کو صدر آزاد کشمیر نامزد ہونے پر شدید تحفظات کا اظہار کیا کہ یہ حکومت پاکستان کے سرکاری ملازم ہیں، ان کا صدر بننا سیاست دانوں کی توہین ہے۔

ایکٹ 1974 کے حامی ہیں۔ میرے خیال میں اس لیے کہ یہ سردار ابراہیم صاحب کے وقت میں نافذ ہوا تھا۔ اپنی جماعت کی اکثر تقاریب پر دوسری جماعت کے لوگوں کو بھی بلاتے ہیں۔ یہ ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ذاتی طور پر متشدد قسم کے پاکستانی ہیں۔ لیکن کشمیر کے بارے میں ان کے خیالات اس حد تک لبرل ہیں کہ عوام جو فیصلہ کریں گے، وہی کشمیر کا حل ہوگا۔ اگر وہ مقامی جماعت کو

قومی جماعت میں بدل لیں یا کسی قومی جماعت میں شمولیت کریں تو قوم کو ایک مخلص لیڈر میسر آجائے گا، محدود سے علاقہ میں رہ کر قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

## عبدالرشید ترابی

آپ کا تعلق ضلع باغ آزاد کشمیر سے ہے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی اسلامی جمعیت طلباء اور پھر جماعت اسلامی سے منسلک رہے۔ بے حد متحرک اور معتمد شخص ہیں۔ کافی عرصہ سے جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر چلے آرہے ہیں اور اس حیثیت میں موصوف تحریک کشمیر کے حوالہ سے بہت متحرک ہیں۔ پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں کشمیر کاز کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ سردار خالد ابراہیم کی طرح بے باک، نڈر اور حق گو سیاسی کارکن ہیں۔ ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا ان کا بھی خاصا ہے۔ آزاد کشمیر میں برادریوں کی سیاست کی وبا ہے، وگرنہ ان جیسا شخص اگر اسمبلی میں آجاتا تو اس اسمبلی کی عزت میں اضافہ ہوتا۔ آزاد کشمیر میں تین آدمی جو بہت سارے معاملات میں ہم خیال ہیں، اگر ایک پلیٹ فارم پر آجائیں یا کم از کم ایک متفقہ ایجنڈا پر اکٹھے ہو جائیں تو مثبت نتائج مرتب کروا سکتے ہیں۔ یہ تین اشخاص ترابی صاحب کے علاوہ خالد ابراہیم اور راجہ فاروق حیدر ہیں۔ ترابی صاحب کا بھی خالد ابراہیم کی طرح 2016 کے اسمبلی الیکشن میں ن لیگ کے اتحادی تھے جن کے صلے میں ان کو اسمبلی میں ٹیکنو کریٹ کی اور ان کی جماعت کی ایک خاتون کو خاتون نشست پر اسمبلی کی سیٹ دی گئی۔ جماعت کو پہلی مرتبہ بالواسطہ اسمبلی میں دو نشستیں ملیں۔

## جنرل اشفاق پرویز کیانی اور جنرل مشرف

پاکستان فوج کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی کے آئی ایس آئی اور آرمی چیف بننے سے پہلے میرے رسمی تعلقات تو تھے ہی کیوں کہ مری ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ہونے کی وجہ سے آزاد کشمیر کے معاملات پر ان کی مکمل گرفت تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب







میں ہائی کورٹ کا جج تھا۔ جنرل پرویز مشرف کے مارشل لاء کے بعد احتساب کا نیا قانون بنایا گیا جس کے تحت محکمہ جنگلات کے کچھ آفیسران بشمول سیکریٹری اور چیف کنسرویٹرز کو احتساب بیورو نے گرفتار کیا تھا جن کی میں نے ضمانت لے لی۔ اس پر بہت ہلہ گلہ ہوا اور جنرل کیانی نے آزاد کشمیر کے آفیسرز کی ایک میٹنگ میں کہا کہ Can we not fix him up!۔ اس پر تو سول انتظامیہ کے سب بشمول وزیراعظم بیرسٹر سلطان محمود نہیں بولے، لیکن بعد میں کسی فوجی آفیسر نے کیانی صاحب کو کہا کہ اگر آپ اس کو Fix up کر لیں گے تو ہائی کورٹ میں جج کون رہے گا؟ باقی تو سارے انگوٹھا چھاپ ہیں؟ اس کے بعد ایک روز انہوں نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ اس ملاقات کے بعد ان کے میرے ساتھ بہت ہی برادرانہ اور مشفقانہ تعلقات ہو گئے اور یہ تعلقات بحال بھی رہے۔ کیانی صاحب کشمیر کے حالات، سیاست اور لیڈرشپ کے معاملات پر محتاط انداز میں گفتگو کرتے رہتے تھے اور غالباً ان کو اس موضوع پر میرے نقطہ نظر سے اتفاق تھا جس وجہ سے آئی ایس آئی چیف بننے کے بعد ہمارے کشمیر کے حوالے سے تعلقات زیادہ گہرے رہے۔ وہ عملی سوچ کے حامل فوجی افسر تھے۔ اپنے پیش رو کی مہم جوئی والا رویہ نہیں رکھتے۔ جنرل صاحب، علی گیلانی صاحب کے غیر لچکدار رویہ پر زیادہ خوش نہیں تھے۔ البتہ میر واعظ وغیرہ کے لچکدار رویہ کی تعریف کیا کرتے تھے کہ اس طرح کوئی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ تاہم گیلانی صاحب کی پاکستان دوستی اور اصول پسندی کے بہت مداح تھے۔

میں نے ان کو کہا کہ کشمیر کا فیصلہ صرف ان دو گروپس نے نہیں کرنا، ہندوستان نواز کشمیری جماعتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا بھی کشمیر پر اتنا ہی Stake ہے جتنا حریت پسندوں کا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے کہ یہ عملی سوچ ہے مجھے مشورہ دیا کہ میری صدر مشرف سے ملاقات ہونی چاہیے تاکہ میں ان کو اس پس منظر سے واقف کر سکوں۔ اس کے بعد 8 اگست 2004 کو میری جنرل پرویز مشرف سے راولپنڈی آرمی ہاؤس میں دو گھنٹے سے زائد ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے کشمیر کی آئینی، سیاسی اور علاقائی صورتِ حال پر سوالات کیے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان لوگوں کو کشمیر کے زمینی حقائق سے یا تو دلچسپی نہیں ہے یا ان کو غلط اطلاعات پہنچائی جاتی ہیں۔ کشمیر اور ہندوستان کے آئینی تعلق

اور کشمیر میں کشمیری اور غیر کشمیری بولنے والوں کے تعلقات اور ناپسندیدگی کا سن کر جنرل مشرف کو حیرانی ہوئی۔ ملاقات میں جنرل کیانی کو بھی بلایا گیا بہت ساری بات چیت ان کی موجودگی میں ہوئی۔ میں نے جنرل صاحب کو کہا کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیر کے سب لوگوں اور سیاسی جماعتوں نے کرنا ہے۔ جس میں غیر مسلم، کشمیری پنڈت اور ہندوستان نواز مسلمان بھی شامل ہیں، اس لیے آپ کے تعلقات سب کے ساتھ ہونے چاہئیں۔ حمایت چاہے جس کی کریں لیکن On Board سب کشمیر جماعتیں ہونی چاہئیں خصوصاً جو لوگ کئی دہائیوں سے کشمیر اور ہندوستان کی سیاست کر رہے ہیں۔ جنرل صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی اور مجھے کہا کہ اگر آپ اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ جنرل صاحب نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان یو این ریزولوشن کو نہیں مانتا لیکن ہم ہندوستان کے اس موقف کو کبھی نہیں مانیں گے۔ کشمیر کا مسئلہ زندہ ہے اس کو ایسے حل کرنا پڑے گا جس سے کشمیریوں کو ریلیف ملے اور سب کے لیے Win win situation ہو۔

میں نے ان دنوں بس کے ذریعہ کشمیر جانے کے لیے درخواست دے رکھی تھی اور ہندوستان سے مجھے اطلاع ملی تھی اگر پاکستانی حکام مجھے کمان پل پر لے آئیں تو ہندوستان کشمیر میں داخلے کی اجازت دے دے گا، یہ بات بھی میں نے جنرل صاحب کو کہی تو انہوں نے فوری طور پر متعلقہ حکام کو کہا کہ ان کو کمان پل ہندوستان کی لائن تک لے جائیں۔ انہوں نے علی گیلانی صاحب کے خلاف بہت غصے کے جذبات کا اظہار کیا کہ ان کو ہمارے معاملات فاٹا وغیرہ کے بارے میں نہیں بولنا چاہیے۔ مجھے یہ بھی کہا کہ جس قدر ممکن ہو وہاں ہر سوچ کے لیڈروں سے ملیں اور ان کو کہیں کہ آنے والی صورتِ حال کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈھالیں۔ میر واعظ کو اعتدال پسند لیڈر کے طور پر پراجیکٹ کرنے کا انہوں نے عندیہ دیا جس پر میں نے ان کو کہا کہ وہ محبوبہ مفتی اور عمر عبداللہ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ''وہ کشمیر کا مستقبل ہیں۔'' آزاد کشمیر کی سیاست پر بھی سیر حاصل بات ہوئی، ادھر کی لیڈرشپ میں سے ان کو سردار عتیق خان بہت پسند تھے اور پاکستان کی طرف سے اس کو بالمقابل لیڈر Project کرنے کا پرزور اظہار کیا۔



10 یا 12 اگست 2005 کو مجھے اپنی فیملی کے سمیت چکوٹھی کمان پل[230] پر طے شدہ پروگرام کے مطابق پہنچایا گیا جہاں ہندوستان کی اتھارٹیز نے کہا کہ ان کو میرے بارے میں اطلاع ہے اور مجھے وہاں سے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کی تفصیل الگ الگ موضوعات میں درج ہے۔ تاہم اس دورہ میں مجھے کشمیر کے اندر سرکاری اور غیر سرکاری طور پر بھرپور پذیرائی ہوئی۔ چوں کہ پاکستان کی سب سے بڑی اتھارٹیز کی طرف سے مجھے وہاں لیڈرشپ کو ملنے کا اشارہ ملا تھا، اس لیے میں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہاں گیلانی صاحب اور حریت کی دیگر لیڈرشپ کے علاوہ گورنر سنہا، عمر عبداللہ، مفتی سعید، محبوبہ مفتی، کشمیر کے چیف سیکریٹری، ہائی کورٹ کے ججوں بار ایسوسی ایشنز وغیرہ میں لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے عمر عبداللہ اور محبوبہ سے کہا کہ آپ بھی کشمیر کے حوالہ سے اپنا کردار ادا کریں اور پاکستانی لیڈروں سے رابطہ رکھیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ لوگ ہمیں بلائیں تو ہمیں ان سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

چنانچہ واپسی پر میں نے جنرل صاحب سے دوبارہ ملاقات کی اور کشمیر کے حالات اور کشمیری لیڈروں کی سوچ سے ان کو مطلع کیا۔ جب میں نے ان کو کہا کہ وادی کشمیر کی غالب اکثریت خود مختار کشمیر کے حق میں ہے لیکن ایسا آپشن نہ ہوا تو پاکستان کے ساتھ ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہماری بھی یہی اطلاع ہے۔ مجھے عمر عبداللہ کی بات سے لگا کہ وہ لندن یا دبئی میں پہلے بھی اسٹیبلشمنٹ کے کچھ لوگوں سے مل چکے تھے۔ حکومت میں یقیناً اس سلسلہ میں کوئی ذرائع ہوں گے جہاں کام ہوا ہوگا۔ البتہ جب میں نے جنرل صاحب کو کہا کہ محبوبہ اور عمر عبداللہ بھی پاکستان آنے کو تیار ہیں تو وہ اچھل پڑے کہ یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔

اس کے بعد حکومتی سطح پر یقیناً سرگرمیاں ہوئی ہوں گی جس کے نتیجے میں 10 مارچ 2006 کو عمر عبداللہ، محبوبہ مفتی، عبدالرحیم راتھر، سجاد لون تاریگامی، عبدالغنی وکیل، حکیم یاسین، پروفیسر عبدالغنی بھٹ پاکستان کے دورے پر آئے جس کے دوران سوائے عمر عبداللہ اور یاسین ملک کے علاوہ باقی سب لوگ اسلام آباد میرے گھر پر بھی تشریف لائے۔ ان دنوں میں اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھا

کیوں کہ میرا مظفر آباد والا مکان زلزلہ کی وجہ سے ناقابل رہائش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کشمیری لیڈروں کا پاکستان آنے جانے کا تانتا بندھ گیا اور اسی طرح پاکستانی بھی ہندوستان اور کشمیر جانے لگے۔ کشمیر لیڈروں کی پاکستان وزٹ کے دوران عمر عبداللہ کے ساتھ میری سرینہ ہوٹل اسلام آباد میں خصوصی ملاقات بھی ہوئی جہاں انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کے وزٹ کے حوالہ سے بہت کردار ادا کیا۔ انہوں نے مجھے اپنی جماعت کی Autonomy Report کی کئی کاپیاں بھی دیں۔

جنرل مشرف نے کشمیر پر ایک سپیشل قانونی کمیٹی بھی وزیر اعظم پاکستان کی سربراہی میں تشکیل دی تھی جس کا میں بھی ممبر تھا۔ اس کی تفصیل کشمیر ایشو کے باب میں درج ہے۔ جنرل صاحب ذاتی طور بہت بولڈ، دور اندیش لیکن مہم جو تھے۔ جو بات ان کے ذہن میں آتی، وہ اس کے مضمرات کا اندازہ لگائے بغیر کر گزرتے۔ کان کے بہت کچے تھے اور جن لوگوں کی ان تک رسائی تھی ان کی بات کو Face Value پر ہی مان لیتے تھے۔ میرے خیال میں ہر غاصب حکمران کی یہ مجبوری ہوتی ہے کیوں کہ اس کو کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ جب سپریم کورٹ میں میرے چیف جسٹس بننے کا وقت آیا تو اپنے ایک قریبی جرنیل ندیم اعجاز جو ملٹری انٹیلی جینس کے ڈی جی تھے، کی مرضی اور جھوٹی رپورٹ پر مجھے چیف جسٹس نہ بننے دیا اور پھر جنرل کیانی کو کہا کہ ان کے لیے کوئی اور جگہ دیکھیں۔ اس پر کیانی صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا لیکن میں کسی اور جگہ کے لیے نہیں مانا اور ان کو کہا کہ مجھے میرا حق ملنا چاہیے۔ میں کوئی اور نوکری خیرات کے طور پر نہیں لینا چاہتا۔

اس خدشہ کا اظہار میں نے جنرل کیانی صاحب کو بہت پہلے ایک میٹنگ میں کیا تھا کہ جنرل ندیم آزاد کشمیر میں الیکشن میں دھاندلی کرانے کے سلسلہ میں ریاض اختر کو چیف جسٹس بنوانا چاہتا ہے جس پر کیانی صاحب نے کہا کہ اندھیر نگری نہیں ہے۔ لیکن جب ایسا ہو گیا تو میں نے جنرل صاحب کو کہا، جنرل صاحب اندھیر نگری ہی نہیں چوپٹ راج بھی ہو گیا! انہوں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میرے ساتھ تمام تر ہمدردی کے باوجود جنرل کیانی غالباً اس وجہ سے اس معاملے میں خاموش ہو گئے کہ آگے ان کے آرمی چیف بننے کا معاملہ زیر غور تھا، اگر وہ جنرل مشرف کے اس فیصلہ پر اعتراض کرتے تو







جنرل مشرف اور اعجاز ندیم کی ناراضی مول لے سکتے تھے۔ لیکن ان کو اس بات کا بہت دکھ رہا۔ مجھے راجہ فاروق حیدر نے کہا کہ جنرل کیانی سے ان کی ایک گھنٹے کی ملاقات میں نصف گھنٹہ مجھ پر صرف ہوا اور ان کو میرے چیف نہ بننے پر بہت دکھ تھا۔

جنرل کیانی نے مجھے کہا کہ حریت رہنماؤں نے جنرل مشرف اور کیانی پر زور ڈالا کہ ہندوستان کو ریاست میں وزیر اعظم اور صدر ریاست اور 1953 سے پہلے کی پوزیشن بحال کرنے کو کہا جائے تا کہ مشرف کے چار نکاتی نظریہ کے ساتھ یہ معاملہ بھی حل ہو جائے۔ لیکن بقول جنرل کیانی، جنرل مشرف ایسا کرنے پر راضی نہ ہوئے کیوں کہ اس سے ہندوستان کے آئین میں ترمیم مطلوب تھی جو ممکن نہیں۔ جب مجھ سے جنرل کیانی نے یہ بات کی تو میں نے ان سے کہا کہ وزیر اعظم، صدر ریاست اور گورنر کے عہدے ریاستی آئین کے تحت ہیں، ان کی حد تک ہندوستان کے آئین کی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح 1953 والی پوزیشن کی بحالی بھی دفعہ 370 کے تحت صدر مملکت کے انتظامی حکم کے تحت ہو سکتی ہے جس میں بھی ہندوستانی آئین کی ترمیم یا پارلیمنٹ کی منظوری درکار نہیں ہوتی۔ یہ سن کر جنرل کیانی ششدر رہ گئے کہ کیا یہی آئینی پوزیشن ہے؟ یہی بات مجھے خورشید قصوری وزیر خارجہ نے بھی کہی تھی اور وہ بھی جواب سن کر حیران رہ گئے۔ اس عدم علمیت کی وجہ سے پاکستانی حکمران کشمیر کے معاملے میں ہندوستان سے مار کھاتے ہیں۔ ہندوستان کے آئین میں کئی ایسی دفعات ہیں جن کی روشنی میں پاکستان اس کو آڑے ہاتھوں لے سکتا ہے لیکن یہاں رٹی رٹائی باتوں سے کام چلایا جاتا ہے۔

حیرانی کا مقام ہے کہ پاکستان کا کشمیر پر بلند و بانگ دعویٰ ہے لیکن ہندوستان میں اس کی آئینی پوزیشن سے یہ لوگ بے خبر ہیں! جب حریت کانفرنس کے لوگ دوسری بار پاکستان آئے اور جنرل مشرف کے ساتھ ان کی اس بارہ میں دوبارہ بات ہوئی انہوں نے پھر یہی بات دہرائی، جس پر پروفیسر عبدالغنی بھٹ، (جس نے مجھے خود بتایا) نے جنرل مشرف سے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی ہندوستانی اور کشمیری آئین کا ماہر نہیں ہے۔ جنرل مشرف کا جواب تھا کہ ایک شخص تھا (میرا نام لیا) لیکن سکیورٹی رپورٹس کی وجہ سے وہ چیف جسٹس نہ بن سکا جس وجہ سے وہ ناراض ہے۔ پھر بقول پروفیسر غنی، جنرل

کیانی کو پرویز مشرف نے کہا کہ منظور گیلانی صاحب کو منوائیں۔ اس کے بعد جنرل کیانی نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا اور جنرل مشرف سے ملاقات کا اہتمام کرنے کو کہا لیکن بعد میں یہ ملاقات نہیں ہو سکی کیوں کہ چیف جسٹس پاکستان کے ساتھ جنرل مشرف اور باقی جرنیلوں کی بدتمیزی کی وجہ سے حالات ہی دگرگوں ہو گئے اور جنرل مشرف خود اس ہنگامے کی نذر ہو گئے جو انہوں نے چیف جسٹس اور پوری پاکستانی عدلیہ کے ساتھ برپا کیا تھا۔ اگر جنرل مشرف نے ایسا نہ کیا ہوتا تو یقیناً ہندوستان کے ساتھ پاکستان نے ڈیل کر لی ہوتی جس سے پاکستان یا کشمیریوں کے ہاتھ تو کچھ نہ لگتا لیکن جنرل مشرف اور چند سال صدر رہ جاتا۔ قدرت کو ایسا کرنا ہی منظور تھا۔ اچھا ہوا۔ جنرل مشرف کی اس حرکت سے پاکستان میں اداروں کا احیا شروع ہو گیا، حدود تعین ہونے لگے، سیاست اور جمہوریت پنپنے لگی اور پاکستانی ادارے Settlement کی طرف بڑھنے لگے۔ عقلمندوں نے صحیح کہا ہے کہ مصیبت بھی مواقع پیدا کرتی ہے، جنرل مشرف کی پیدا کردہ مصیبت کا فائدہ پاکستان کے تمام اداروں کو مل رہا ہے۔

جنرل مشرف کے ساتھ براہِ راست تعلقات سے پہلے میری جنرل مشرف سے خط و کتابت بھی تھی۔ مظفر آباد میں میرے مکان کے قریب فوجی سٹیڈیم ہے جو فوجی ہیلی پیڈ کے طور بھی استعمال ہوتا ہے۔ میں نے جنرل مشرف کو خط لکھ کر اس طرف توجہ دلائی کہ ان کی وجہ سے ہمارے مکان ہل کر رہ گئے ہیں اور صبح شام مستقل نیوسنس پیدا ہو رہی ہے۔ اس لیے ان کو کسی اور جگہ بالخصوص ایئر پورٹ پر شفٹ کیا جائے جو خالی پڑا ہے۔ جنرل صاحب نے آرمی ایویشن کے دو بریگیڈیئر بھیج کر اس کا جائزہ لیا اور فیصلہ ہوا کہ ہیلی پیڈ یہاں سے شفٹ کر کے ایئر پورٹ لے جایا جائے۔ کچھ عرصہ بعد ہی جنرل صاحب کا ایک خط موصول ہوا کہ کارگل اور نیلم میں جنگ کی وجہ سے لیپہ اور کیل میں سامان کی ترسیل کے لیے سٹیڈیم کو ہیلی کاپٹرز کے لیے استعمال کرنا ناگزیر ہے، اس لیے دوبارہ وہاں سروس ہو گی۔ میرا مطلب ہے کہ شکایت کا نوٹس ایسا لیتے تھے اور جس حد تک ممکن ہو، اس کا تدارک بھی کرتے تھے، اس لحاظ سے خیال کرنے والے شخص تھے۔

کارگل مہم جوئی اور چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف کارروائی نے ان کو بیرون ملک







اور اندرون ملک تنہا کر کے نکلنے پر مجبور کر دیا اور اپنی مہم جوئی کی وجہ سے ساری فوج کی جگ ہنسائی کروائی حالاں کہ پہلے تین ڈکٹیٹر فوج کے لیے کسی طور بدنامی کا باعث نہیں بنے تھے گو کہ ان سب کے غیر آئینی اقدامات نے ملک میں اداروں بالخصوص سیاسی اداروں کا استحکام نہیں ہونے دیا۔

اب کی بار پاکستانی فوج تاریخ میں پہلی بار دفاعی پوزیشن میں چلی گئی۔ کوئی باوردی فوجی بازار یا شہر میں نہیں جاتا تھا۔ فوجی گاڑیاں بکتر بند لوگوں کی کمان میں سفر کرتی تھیں، ایسے دن پاکستانی فوج نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جنرل کیانی اور جنرل راحیل شریف نے اب فوج کو تنہائی سے نکال کر اس کی سابقہ عزت بحال کر دی ہے۔ جنرل مشرف پہلے فوجی جنرل ہیں جو آئین توڑنے پر بغاوت کا مقدمہ بھگت رہے ہیں جبکہ ان کے معاونین تماشا دیکھ رہے ہیں۔ جنرل صاحب ایک مہم جو لیڈر تھے جو کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے تھے۔ جنرل راحیل شریف نے ان کے خلاف حکومت کے بغاوت کے مقدمہ میں ان کا بھرپور ساتھ دے کر بچا لیا، جنرل راحیل شریف تمام تر خوبیوں اور کامیابیوں کے باوجود اس معاملہ میں قصوروار ہیں۔

## امان اللہ خان اور راجہ مظفر خان

جناب امان اللہ خان، گلگت نژاد ریاستی باشندے، زندگی بھر کشمیر کی خودمختاری کے داعی رہے ہیں۔ دنیا کے کئی ملکوں میں اس تحریک کے سلسلہ میں ہونے والی سرگرمیوں کی وجہ سے زیر عتاب اور اسیر بھی رہے لیکن پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ پوری ریاست جموں و کشمیر (جو 14 اگست 1947) کے وقت مہاراجہ کے کنٹرول میں تھی، کو ایک آزاد اور خودمختار ملک کے طور پر دیکھنا اور اس کی تگ و دو اور ان کی زندگی کا منتہائے نظر رہا ہے۔ ان کا زندگی بھر کا تعلق جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ سے رہا۔ نوّے کی دہائی میں جب مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی تحریک عسکری لحاظ سے عروج پر تھی، امان اللہ خان صاحب نے ریاست ہائے متحدہ جموں و کشمیر کی جلاوطن حکومت کی بنیاد ڈالی لیکن اس کو مقامی یا عالمی سطح پر کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ ریاست ہائے متحدہ سے ان کی مراد جموں، کشمیر، لداخ،

گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کی اکائیوں کی کنفیڈریشن تھی۔ کشمیر میں عسکری تحریک کی بنیاد لبریشن فرنٹ نے امان اللہ خان صاحب کی سربراہی میں جنرل ضیاالحق مرحوم کے کہنے اور مدد سے ڈالی تھی لیکن بعد ازاں لبریشن فرنٹ نے رضا کارانہ طور پر ہی اس کو ترک کر کے پُرامن تحریک چلانے کا اعلان کیا۔

ان کے دست راست لوگوں میں سے آزاد کشمیر میں راجہ مظفر خان اور مقبوضہ کشمیر میں محمد یاسین ملک تھے۔ لیکن یہ سب لوگ آہستہ آہستہ ان سے الگ ہو گئے مگر سب کا منتہائے نظر نظریہ خود مختار کشمیر ہی رہا۔ راجہ مظفر خان صاحب، امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں جبکہ یاسین ملک سرینگر میں ہی مقیم لیکن متحرک ترین لیڈر ہیں جو پاکستان میں اپنی بیوی مشال ملک کے ذریعہ متحرک ہیں۔

راجہ مظفر خان صاحب امریکی سینیٹرز اور کانگریس کے لوگوں سے بھرپور رابطے میں ہیں اور امریکہ میں کشمیری کیمونٹی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ کشمیر کے مسئلہ کا پُرامن حل چاہتے ہیں جو سلامتی کونسل کی قراردادوں سے ماورا بھی ہو تو اس کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ راجہ صاحب، جنرل مشرف کے فارمولہ کو اچھی پیش رفت سمجھتے ہیں جو مسئلہ کے حل کی طرف ایک پیش قدمی ہے۔ دونوں صاحبان محمد مقبول بٹ مرحوم کی میراث کے امین ہیں جن کو دہلی کی تہاڑ جیل میں پھانسی کے ذریعہ موت کی سزا دی گئی تھی۔

2015 ستمبر میں مجھے کیلیفورنیا امریکہ میں ان سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہوا جہاں میں ان کو ملنے کے لیے خصوصی طور بوسٹن سے گیا۔ انہوں نے مجھے متعدد مقامات کی سیر بھی کرائی اور چار دن ہم لوگ کشمیر کے ہر پہلو پر بحث و تمحیص کرتے رہے۔ گو کہ میرے اور ان کے نظریہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن کشمیر کے پُرامن حل پر بہر حال اتفاق کرتے ہیں، وہ جیسا بھی ہو لیکن اس میں لوگوں کی مرضی کا دخل ضرور ہونا چاہیے۔

امان اللہ خان صاحب سے میرا کوئی ذاتی واسطہ یا رابطہ نہیں رہا۔ سرِ راہ ملاقات اور دعا سلام ہوتی رہی۔ لیکن وہ استقلال اور ثابت قدمی کی وجہ سے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ اگرچہ ان کے نظریہ کی کامیابی اور پائیداری سے میں نے کبھی اتفاق نہیں کیا لیکن ان کی جدوجہد کا ہمیشہ معترف رہا۔ نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی کے ایک فنکشن میں انہوں نے مجھے کہا، ''آپ کے اکثر کالم پڑھ کر مجھے بہت





ذہنی کوفت ہوتی ہے۔'' اس پر میں نے ان کو جواب دیا، آپ کے نظریہ سے میں بھی اتفاق نہیں کرتا لیکن آپ کی سوچ اور فکر کی قدر کرتا ہوں۔ کشمیر کا یہ بہادر فرزند 26 اپریل 2016 کو دارِ فانی سے کوچ کر گیا لیکن ان کا کشمیر کی آزادی کا خواب آج بھی زندہ ہے۔ ان کی رحلت راولپنڈی میں ہوئی لیکن تدفین گلگت میں ان کے آبائی علاقے استور میں ہوئی۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

آزاد کشمیر کی مقامی سیاست سے چوہدری لطیف اکبر کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا جو 1985ء سے سیاست میں پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے متحرک ہیں، کئی بار اسمبلی کے ممبر اور منسٹر رہے۔ پارٹی کے ساتھ وابستگی ان کا طرۂ امتیاز ہے جس وجہ سے جماعت کے سیکریٹری جنرل رہے اور اب صدر ہیں۔ لوگ عمومی طور پر ان کے خلاف برادری ازم کا الزام لگاتے ہیں جس تاثر کو انہیں دور کرنا پڑے گا۔